نگار

نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ نگار

۱ ۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ ۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا

۳ ۔ خط وکتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کردیے جاتے ہین

۴ ۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ ۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین ۔

۶ ۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلیے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

- اردوے معلی عہ
- عود ہندی عہ
- دیوان غالب ۸ر
- مکمل دیوان عہ

مولانا نذیر احمد

- حمائل مترجم ۔ عہ
- الحقوق والفرائض ۔

- بنات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظہ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامی عہ
- فسانہ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- 〃 دوم عہ
- 〃 سوم عہ
- الفاروق ۶ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- سفرنامہ مصر و شام ۶ر
- علم الکلام ۶ر
- الکلام ۶ر
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول عہ
- 〃 دوم ۶ر
- 〃 سوم ۶ر
- 〃 چہارم عہ
- 〃 پنجم ۶ر
- موازنہ انیس و دبیر عہ
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی ۶ر
- کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی

- امیر اللغات عہ
- صنمخانہ عشق عہ
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی ۶ر

رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد عہ
- سیر کہسار عہ
- خدائی فوجدار ۶ر
- جام سرشار ۶ر
- الف لیلیٰ بطرز ناول عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۳ - شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صر ہندوستان سے باہر علاوہ محصول صعر

فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۲۸ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
ملاحظات		۲
ڈائری کا ایک ورق		۵
سیر ممنون	آسی	۹
نغمہ پرست	محشر عابدی	۲۳
لارڈ رپن کا عہد حکومت	ص - ا - ب بی اے	۲۸
کلیات قطب شاہ	عالی رفاعی	۳۳
زن مرید (فسانہ)	عابد بلہوری	۴۳
فلسفہ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۵۳
جگناری (فسانہ)		۵۷
تذکرۂ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر	"آرگس"	
نصر اللہ - عبد الماجد اور نیاز		۷۷
باب الاستفسار		۸۴
بکھریاں (نظم)	حامد اللہ افسر	۸۷
عروس سحر (نظم)	حافظ غازی پوری	۸۸
ترانۂ خودی	امین حزیں	۹۰
غزلیات :-	آزاد انصاری	۹۱
"	باسط بسوانی	
"	مرزا جعفر علی اثر	
"	مسعود علی ندتی	
"	تبسم نظامی	
"	جگر بریلوی	
معلومات		۹۴ تا ۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۳ | مئی ۱۹۲۸ء | شمارہ ۵

ملاحظات

وقت وموسم کی قوت مسلم ہے اور تمام عالم خلق کا تغیر بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، انسان کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کے مضر و مکلف اثرات کا مقابلہ کرے، اور چونکہ فطرت کے ساتھ اس کی یہ جنگ ابتدائے کائنات سے چلی آ رہی ہے، اس لئے اس قدر کہنہ مشقی کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بقدر جرحیات کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ لکھنؤ کا آفتابی موسم شروع ہو گیا ہے۔ اور اب "دلِ راحت طلب" کو اکثر استاد وزیر کا یہ مصرع یاد آتا رہتا ہے کہ:۔

زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اگر ان حالات کے ماتحت آئندہ چند ماہ میں کوئی "بدحواسی" مجھ سے سرزد ہو جائے تو معاف فرمایا جاؤں، کیونکہ اب پریس کی نگرانی کے خیال سے میں لکھنؤ کو چھوڑ کر باہر کسی سرد مقام پر بھی یہ زمانہ بسر نہیں کر سکتا۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں جو مضمون کلام درد کے متعلق شائع ہوا تھا، اس پر جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے بھی ایک طویل مضمون مرحمت فرمایا ہے۔

جو مقالہ گزشتہ اشاعت میں، جناب آرگس کا شائع ہوا تھا اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ دیوان درد جو نظامی پریس

بدایوں سے شایع ہوا ہے وہ بہت غلط ہے اور اسی سلسلہ میں کلام درد کے جو مختلف جدید و قدیم نسخے ملے اُن کا مقابلہ کرکے یہ بتایا گیا کہ فلاں شعر میں فلاں نسخہ قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔

جناب اثر لکھنوی کو اکثر مقامات پر جناب آرگس کی تحقیق سے اتفاق ہے لیکن مرسلہ مضمون میں صرف اختلافات کو ظاہر کیا گیا ہے، مگر یہ اختلافات اکثر و بیشتر وہ ہیں جو صرف ذوق سلیم اور قیاس کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ بحث کو کلام درد کے مختلف نسخوں ہی تک محدود رکھ کر انھیں کے اندر قیاس سے کام لیا جاتا۔ بہرحال جناب اثر لکھنوی کی یہ انتہائی "ادب پرستی" ہے کہ اُنھوں نے باوجود کثیر مشاغل کے یہ مقالہ تحریر فرمایا جو غالباً کسی آئندہ اشاعت میں درج ہو سکیگا۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آسی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے، مجھ سے ایک جگہ غلطی ہو گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ جناب آسی کا شعر ہے:-

کرم اے تمکنتِ حسن غریبوں پہ کرم	کیا ملیگا انھیں خود بین خود آرا کرکے

میں نے یہ سمجھ کر کہ دوسرے مصرع میں "انھیں" کا مرجع "غریبوں" ہے، یہ اعتراض کیا تھا کہ غریبوں یعنی عشاق میں خود بینی و خود آرائی پیدا ہونے کی پیشین گوئی نامناسب ہے۔ لیکن جناب آسی نے فرمایا کہ انھیں سے مراد انکا محبوب ہے، اور میں نے سمجھنے میں غلطی کی جسکا مجھے اعتراف ہے اس صورت میں شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

کلام آسی پر تنقید کے سلسلہ میں گزشتہ ماہ کچھ فقرے میرے قلم سے ایسے بھی نکل گئے ہیں، جن سے ایک شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ شاید میرے نزدیک لکھنؤ میں کوئی شاعر آج تک ہوا ہی نہیں اور نہ اس وقت موجود ہے۔ مضمون شائع ہونے کے بعد جب میں نے اُسے غور سے پڑھا تو میں نے بھی اس کو محسوس کیا اور تکلیف کے ساتھ محسوس کیا۔ میرا مقصود ہرگز وہ نہیں تھا جو عام طور پر سمجھا گیا، بلکہ مدعا یہ تھا کہ عام طور پر یہاں کا موجودہ رنگِ سخن اچھا نہیں ہے اور غالب حصّہ متشاعرین کا ہے۔ وہ حضرات جو اپنی بعض خصوصیات شعری کے لحاظ سے شاعر تسلیم کرلئے گئے ہیں اُن کی طرف یہ روئے سخن نہ تھا۔

اس ماہ کے مضامین میں دوسرا مضمون میر ممنون کی شاعری پر ہے جسے جناب آسی نے لکھا ہے۔ ممنون کا کلام اس وقت تقریباً نایاب ہے اس لئے جناب آسی کی یہ کوشش قابل تحسین ہے کہ انھوں نے ممنون کی شاعری سے ہمکو روشناس کرایا ہرچند ممنون میرے نزدیک شاعر ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے اور نہ وہ اس درجہ لائق ستائش تھے۔ جس قدر جناب آسی نے انھیں سراہا ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ عہد ذوق و غالب کے ایک نہایت ہی مشہور و مستند شاعر کے کلام کا انتخاب اس طرح ہاتھ آگیا جو اس سے قبل کہیں شائع نہیں ہو میری رائے میں جناب آسی نے بہترین خدمت ادب انجام دی ہے۔

کلیات قطب شاہ پر جناب عالی رفائی نے جو تحقیقی و تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے وہ ہر چند دلچسپ اور سلجھی ہوئی عبارت میں نہیں لکھا گیا ہے، لیکن کام کی چیز ضروری ہے۔

موعودہ مضمون "تذکرۂ آبحیات" پر اس مہینے کے رسالہ میں شروع کر دیا گیا ہے اور آئندہ ماہ کی اشاعت میں ختم ہو جائیگا آزگس نے اس مضمون میں صرف اُن فاحش اغلاط یا غلط بیانیوں کے دکھانے کی کوشش کی ہے جو آزاد سے قصداً یا احیاناً سرزد ہوئیں اور جو ایک مورخ یا تذکرہ نویس کے لئے حد درجہ باعث ننگ ہو سکتی ہیں۔ آزاد کی آب حیات پر اس کے انشاء کے لحاظ سے بھی بحث کرنا پیش نظر ہے، لیکن چونکہ وہ ایسا زیادہ اہم موضوع نہیں ہے اس لئے اس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھا گیا۔ آبحیات کی طرز تحریر پڑھنے والے کے سامنے جس منظر کو پیش کرتی ہے وہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو آپ نے کٹھ پتلیوں کے تماشہ کے وقت دیکھا ہو گا کہ بادشاہ کا دربار قائم ہے اور چوں چوں کرتی ہوئی پتلیاں یکے بعد دیگرے آتی جاتی ہیں اور تماشہ والا ان کا تعارف کراتا ہے کہ یہ بیربل ہیں، یہ فیضی ہیں یہ فلاں ہیں، ——— میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی اہمیت آبحیات کی انشاء کو حاصل نہیں ہے۔ تذکرہ یا تاریخ کے لئے جس سادہ و سنجیدہ زبان کی ضرورت ہے اس کی ہوا بھی آبحیات کو نہیں لگی اور طرز تحریر کے اسی نقص نے آزاد کے لئے تحریف میں اس قدر آسانیاں پیدا کر دیں۔ آبحیات کا مقدمہ ایک مستقل تنقید کا محتاج ہے کیونکہ اس میں آزاد نے اور زیادہ بے راہ روی سے کام لیا ہے۔ ممکن ہے اسی سلسلہ میں وہ بھی آجائے

نظموں میں مسٹر حامد اللہ افسر کی نظم "پنگھوڑیاں" کے عنوان سے ایک خاص رنگ کی شاعری ہے جو لوریوں کا جواب کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لئے کوئی لٹریچر نثر میں بھی ایسا موجود نہیں ہے جو ان کے سادہ و معصوم دماغ کو فطری اصول کے لحاظ سے اپنی طرف متوجہ کرے، چہ جائیکہ نظم، اس لئے افسر صاحب کی یہ کوشش یقیناً قابل داد ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر شعراء بھی اس طرف متوجہ ہوں۔

جناب حافظ غازی پوری کی نظم "عروس سحر" کا اکثر حصہ خوب ہے اور جس نزاکت خیال کے ماتحت شروع کیا گیا ہے اُس کو اخیر تک نباہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈائری کے سلسلہ میں جو واقعہ یا فسانہ شروع ہوا تھا وہ اس ماہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس لئے اس کو جگہ دی گئی کہ یہ سب سے اخیر میں لکھا گیا ہے۔ اور پہلی کاپی ہمیشہ سب کاپیوں کے بعد ہی چھپتی ہے آئندہ بھی ڈائری کا سلسلہ قائم رہیگا چنگاری غالباً جون میں ختم ہو جائے۔ "زن مرید" جناب عابد پلھوری کا فسانہ ہے اور انشاء و طرز بیان کے لحاظ سے خوب ہے۔ پلاٹ بھی برا نہیں ہے۔ محشر عابدی کا "نغمہ پرست"، مسز بسینٹ کے کسی مضمون سے لیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری

ڈائری کا ایک ورق

(مسلسل)

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن
میانۂ من و او شوق حائل افتادست

۱۸ سنہ ۶

کل کے انکشافات ایسے نہ تھے کہ میں یوں آسانی سے رات بسر کر لیتا، سوچتا رہا کہ افضال نے جو کچھ کہا وہ ناممکن تو نہیں ہو سکتا لیکن اُس کے لئے ممکن ہونا ایک حد تک ضرور ناممکن معلوم ہوتا ہے غالب کا یہ شعر بار بار مجھے یاد آیا اور سوچتا رہا کہ اگر افضال کا بیان درست ہے تو پھر اس کے نفسیاتی توجیہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

میانۂ من و او شوق حایل افتادست

کیونکہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے میں نہ اس نزاکت کا قایل ہوں کہ

"ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

اور نہ اس خلاف فطرت جذبہ کا کہ

"میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

یہ سب تاویلاتِ بدنصیبی ہیں، ورنہ جن ہونٹوں کا انکار بھی حوصلہ افزا ہو ان کے اقرار کا کیا کہنا۔ بہرحال صبح ہونے کے بعد نہ اس لئے کہ افضال کے واسطے کوئی تدبیر نکالوں، بلکہ محض برنبائے شوق جستجو یہ جی چاہا کہ کچھ وقت تنہائی شیریں کا ملجاتا تو اس باب میں اس کے خیالات بھی [illegible] کرتا۔ میں اب جلد واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہیں دن کے اندر کام کا کسقدر انبار ہو گیا ہوگا میں نے ایک دفعہ گھبر [illegible]۔ میں نے میز سے کاغذ کا ایک پرزہ لیا تاکہ اس کو اطلاع دوں، اتنے میں افضال آگیا، میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ ہنسا اور بولا کہ "نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی، جو دنیا کل تھی آج نہیں ہے، آپ سے گفتگو کرنے کے بعد حالات میں بہت انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ شیریں سے بہت جلد جدا ہو جاؤنگا۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی میں بہت سے کھیل ایسے بھی کھیل سکتا ہے، جن کو کمیڈی یا ٹریجڈی بننے سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیے"۔

میں نے اُسے تعجب سے دیکھا اور پھر بالکل بے اختیارانہ طور پر دریافت کیا۔ "کب" ——— "شاید آج ہی ابھی"

سارا دن گزر گیا اور شیریں سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ کسی خاص معاملہ میں اپنے مشیر قانونی سے مشورہ کرنے گئی تھی اُس کے جانیکے بعد افضال سے یہ مختصر گفتگو ہوئی اور پھر اُس کا بھی پتہ نہ چلا۔ شام کو وہ واپس آئی تو بہت مسرور نظر آتی تھی، مجھے دیکھتے ہی پوچھا

افضال ہیں" میں نے کہا وہ تو آپ کے بعد ہی فوراً چلے گئے اور پھر نہیں آئے" وہ یہ سنکر کچھ سوچتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہوگئی اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندر بلا کر کہا "آپ نے کچھ اور بھی سنا، یہ دیکھئے آپ کے افضال صاحب میرے نام ایک خط چھوڑ گئے ہیں ملاحظہ کیجئے :-

۱۹ر نومبر - ۸ بجے صبح

میری آپ کی زندگی کا افتراق، جسے دنیا نے ہمیشہ اپنی غلطی سے یا ہم لوگوں کی غلط تعبیر حیات سے اتحاد سمجھا، اسوقت سے متوازی چل رہی ہیں، جب آپ نے تھک کر اور میں نے آپ کو تھکا ہوا جان کر، ایک راستہ کو بغیر جانے بوجھے منزل تک پہونچنے والا سمجھ کر اختیار کرلیا۔ پھر جس طرح دو ہمسفر مسافر اس اندیشہ کی بنا پر کہ دوسرا تنہائی میں اس کی دولت نہ لوٹ لے، ایک محتاط خاموشی کے ساتھ راستہ کاٹ دیتے ہیں، اسی طرح میں نے اور آپ نے یہ سفر اختیار کیا اول اول تو اس نے بہت لطف دیا، کیونکہ یقین تھا کہ منزل پر پہونچنے کے بعد خاموشی و ضبط کا یہ کھیل اسی طرح ختم ہو جائیگا کہ ایکدوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں گے اور گلے مل جائیں گے لیکن بعد کو ہم نے محسوس کیا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ منزل کا نشان کچھ دھندلا ہوتا جاتا ہے اور راستہ کی اٹکھیلیاں سنجیدگی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اپنی جگہ کن جذبات کو لئے ہوئی تھیں لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، آپ کے اوقات بھی چند دن بعد اس فکر میں بسر ہونے لگے کہ نقاب کے نیچے کا اصلی چہرہ کیونکر دکھایا جائے اور جس "غلط" کو "صحیح" بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس کو کس طرح مٹایا جائے پھر، اس تمثیل کی دنیا میں، آپ نے کتنے دن زندگی بسر کی؟ اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ چند سال کا تھا لیکن جب اسے گذارنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مکر و فریب کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک مستقل "گرانجانی" ہوتا ہے اور اس کا تحمل بسا اوقات بہت دشوار ہو جاتا ہے

ہم لوگ جس تہذیب کے عادی ہوگئے ہیں اس کی مثال ایک بازیگر کا صندوق ہے جس کے اندر سے وہ ہر مرتبہ ہاتھ ڈال کر ایک ہی چیز کو مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے، درانحالیکہ حقیقت ان سب کی جُدا ہے چنانچہ اس وقت بھی جبکہ میں تمام قدیم رشتوں کو توڑنے کے لئے آمادہ ہوں ——— اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ جو کہنا ہے صاف صاف کہدوں۔ بلکہ وہی پیچیدگی وہی ایک ایک جملہ میں بیسیوں معنی زاد و یہ وہی "کجا می نماید کجا می زند" کی قسم کا انداز بیان اب بھی قائم ہے — خیر بہرحال کوشش کرونگا کہ کم از کم اپنے چہرہ سے تو اب نقاب الٹ ہی دوں اور ممکن ہو تو آپ کو بھی بے نقاب کر دوں۔ سنئے، دنیا میں مرد و عورت کی یکجائی اس حال میں کہ وہ یکذات نہیں ہیں اس قدر مہمل و بے معنی چیز ہے کہ کوئی ذی عقل اس کی تاویل کر ہی نہیں سکتا احسان کی وہ حد نہایت ہی خطرناک ہوتی ہے جب دوسرا اپنے عدم استحقاق کو محسوس کرنے لگے اور میرے خیال میں محسن کشی کے جذبات اسی جگہ پہونچکر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر آج میں اپنے آپ کو آپ سے منحرف پاتا ہوں تو اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مجھ میں اب، آپ کے الطاف و کرم کے برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے اور میں نیا

محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اپنی عنایتوں سے اس حال میں کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہیں۔

بہرحال آج میں اپنے دل کی بغاوت کا آپ سے اعلان کرتا ہوں اور مجبور ہوں کہ کوئی راہ اپنی زندگی کی ایسی نکالوں جو جسمانی حیثیت سے خواہ کیسی ہی مجروح کیوں نہ ہو، لیکن روحانی حیثیت سے بے نیاز اور پرسکون ہو۔

اب جو کبھی سوچتا ہوں کہ اتنے دن میں نے کیوں اور کس امید پر آپ کے ساتھ بسر کئے تو "ساحل و موج کا تعلق" میرے پیش نظر ہو جاتا ہے اور اپنی "تشنہ لبی" کے جمود پر افسوس کرتا ہوں، ممکن ہے آپ کو اپنی "تموج آبی" پر اب بھی فخر و ناز ہو۔ بہرحال جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، اسی طرح میرے صبر و ضبط کی بھی ایک عمر تھی جو آج ختم ہو گئی اور میں اس کی موت کا اعلان آپ سے بھی کر رہا ہوں۔

میں چند دن سے اسی مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ جب دنیا میں رہنا ہے تو اس کے مقرر کردہ اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس لئے دوائے ایک تلخ گھونٹ کی طرح ازدواج کے غیر شاعرانہ طریقہ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، لیکن چونکہ آپ کی طرح میں نے بھی اس کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اس لئے کہنے کی جرأت نہ ہوئی اب بھی اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ آپ مان ہی لیں، بلکہ صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ آپ اس کے بعد مجھ سے نفرت ہی کرنے لگیں اور اس طرح بھی مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

چونکہ میں اب اس معاملہ میں زیادہ رومان پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں ایک خودکشی کرنے والے کی طرح ایسی اطلاع دوں جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہو، میں ابھی یہیں رہوں گا اور سیول ہوٹل میں قیام کروں گا

میں سمجھتا تھا کہ اس خط کا شیریں پر بڑا اثر ہوگا، اور ممکن ہے کہ ایک عورت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں، لیکن یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بہت مسرور و مطمئن تھی اور جس وقت میں خط پڑھ چکا، تو ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے وہ خط مجھ سے واپس لیا اور کہا کہ "مہربانی کرکے آپ افضال کے کمرہ میں جائیے اور دیکھئے ان کے نام کا کوئی خط تو وہاں نہیں ہے، اگر ہو تو لیتے آئیے"

میں گیا تو ایک لفافہ اس کے نام کا میز پر موجود تھا، میں اس کو لے آیا۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ "آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس کو برداشت کریں گے اور یہ تحریر ان تک اسی وقت پہونچا دیں گے"

مجھے پہلے کچھ حیرت ہوئی کہ یہ کیا قصہ ہے لیکن اس کے سمجھنے سے زیادہ ضروری یہ معلوم ہوا کہ کسی طرح افضال سے جاکر ملوں ـــــ جس وقت میں پہونچا تو وہ برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا اور بولا کہ "میں سمجھتا تھا کہ آپ آئیں گے" میں نے کہا ـــــ "مگر یہ تو نہ معلوم تھا کہ آئیں گے اور کچھ ساتھ لائیں گے"۔ میں نے وہ خط اسے دیا اور جب اس نے کھولا تو یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ شیریں نے یہ خط اس کے خط لکھنے سے دو گھنٹہ قبل لکھا تھا۔

خط بہت مختصر تھا لیکن توارد خیال کی عجیب و غریب مثال - اس کا مضمون یہ تھا :-

۱۹ر نومبر ۶ بجے صبح

میری آپ کی خاموش جنگ آج ختم ہوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں اور میرا یہ خط لکھنا گویا آپ کے سامنے سپر ڈالدینا ہے۔

بہرحال اب چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ خیالی دنیا کی زندگی ختم کرکے سوسائٹی کے اصول پر کاربند ہوں اور وہی کروں جو اس سے قبل کرنا چاہئے تھا۔

آج میں اپنے مشیر قانونی سے گفتگو کرکے، کل ہمیشہ کے لئے عمل کے لحاظ سے بھی وہی ہو جاؤنگی جو اب تک خیال کے لحاظ سے تھی۔

یعنی آپ کی ہمیشہ

شیریں

شام کے وقت وہ منظر بھی کس قدر دلکش تھا کہ افضال و شیریں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور افضال اس امر پر متاسف تھا کہ کیوں نہ اس کو شیریں کا خط پہلے ملگیا اور شیریں اس بات پر نادم کہ کیوں اس نے خط لکھنے میں دو گھنٹہ کی عجلت کی۔

یہ بھی قدرت کی ستم ظریفیاں ہیں کہ پہلے تو پورے چھ سال ان دونوں کے اس کوشش میں بسر کرائے ایک دوسرے پر غالب ہو کر نتیجہ تک پہونچیں، اور پھر جب فیصلہ کا وقت آیا تو صورت یہ پیدا کردی کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ شکست کا معترف تھا۔

میں نے یہ منظر دیکھا اور دونوں کو مخاطب کرکے کہا کہ :-

وہ صلح جو فریقین کی شکست پر قائم ہوتی ہے زیادہ مستحکم ہوا کرتی ہے" انھوں نے سنا اور ایک دوسرے کو دیکھکر مسکرانے لگے

نیاز

جدید نمایندۂ نگار

اس وقت تک متعدد نمایندے نگار کے ہوئے، لیکن سب بیکار ثابت ہوئے۔ لیکن اب جناب تبسم نظامی علیگڑھی نے اس خدمت کے بار کو اپنے سر لیا ہے اور فی الحال یو پی کا دورہ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اُن کی سعی کو مشکور بنانے میں کوشش فرمائیں گے

نیاز فتحپوری

میر ممنون

دہلی کے مایۂ ناز شعرا میں سے ایک ہستی میر ممنون کی بھی تھی، میر ممنون کا نام نظام الدین اور تخلص ممنون تھا۔ مگر تخلص کچھ ایسا اس قدر مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام بھول گئے۔ ممنون، میر قمر الدین منت کے بڑے بیٹے تھے۔ قدیم وطن سونی پت تھا۔ رسم زمانہ کیموافق ابتدائی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں مگر انتہائی درسی کتب کی تکمیل اپنے والد سے کی، فارسی کی درسیات تمام وکمال پڑھیں اور عربی کی بھی بقدر ضرورت تحصیل کی۔ جب شعر و شاعری کی طرف توجہ کی تو ابتدائی کلام پر اصلاح بھی اپنے والد سے لی۔ چنانچہ اسی پر ناز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ممنون اک جہاں کو دیا اپنے سخن سے فیض　　منت کی تربیت سے ہوئے فیضیاب ہم

مذہب کے بارہ میں اگرچہ اہل تذکرہ خاموش ہیں مگر ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے، جو ان کے والد کا مسلک تھا، چہاردہ ائمہ معصومین کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

احمد کہ تمام آل اس کی ہے نیک　　ساتھ اس کے ہیں متحد سیزدہ ایک
نام اس کا جو لکھا ہے کرو اس میں ٹک غور　　چودہ یہ عدد ہیں پہ حقیقت میں ایک

کیا نعت رتبۂ علی کیجئے بیاں　　ہر فکر بلند آکے ہو لیست یہاں
جس دوش پہ تھا مہر نبوت کا نقش　　بنتا ہے وہیں اسکے قدم کا بھی نشاں

اسی قسم کی متعدد رباعیاں اور متعدد اشعار ان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں جس سے ان کے مذہب و مسلک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر ممنون اوائل عمر میں دلی میں رہے اس کے بعد اپنے والد کے ہمراہ کچھ دن تک لکھنؤ میں قیام رہا مصحفی، انشاء وغیرہ کے ساتھ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور یہاں انکی مشق کی قوت نہایت ترقی کر گئی

وہ جب لکھنؤ سے دہلی کی جانب واپس گئے تو وہ وقت تھا کہ اکبر شاہ ثانی دہلی کی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ پھر بھی چونکہ علم و فضل کی قدر دانی خاندان تیموریہ کی خصوصیت تھی لہذا بہت سے شعرا اون کے دامن فیض سے وابستہ تھے شاہ نصیر اور ان کے معاصرین کا دہلی میں طوطی بول رہا تھا۔ ذوق اور غالب مومن وغیرہ کی شاعری کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ بادشاہ کو شعر و شاعری کا ذوق تھا اور خود بھی کبھی کچھ کہتے تھے۔ ذرہ تخلص کرتے تھے۔ میر ممنون کی شہرت چونکہ کافی ہو چکی تھی اس لئے آتے ہی دربار تک رسائی ہوئی اور چند ہی روز میں بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے اور پیشگاہ سلطانی سے فخر الشعرا کا خطاب ملا مفتی صدر الدین آزردہ نہیں

کے شاگرد تھے۔

دربار شاہی میں انکی کافی قدر دانی ہوئی مگر حکام انگریزی نے اور بھی قدر دانی کی اور صدر الصدوری کے ممتاز عہدہ پر متعین کرکے اجمیر بھیجدیا جہاں وہ ۱۲۳۰ھ بلکہ ۱۲۵۱ھ تک رہے دلی اس وقت باکمالوں سے بھری ہوئی تھی کبھی کبھی وطن کی کشش انتے دور و دراز مقام سے کھینچکر دلی لے آتی تھی۔ اور یہاں مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

آخر عمر میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر مستقلاً دہلی چلے آئے تھے اور یہیں ۱۲۶۰ھ میں ہنگامۂ غدر کے بعد انتقال کیا۔ تاریخ وفات یہ ہے:—

میر ممنوں از جہاں بگزشت و نزد عاقلے زندگی رہ از ممات او بود حکم ممات

بہر ترکیب فکر بردم گفت ناگہ پیر عقل "شاعر شیریں زبان ہند" تاریخ وفات

میر ممنون کی شاعری

جس زمانہ میں میر ممنون شعر و شاعری کی دشوار گزار وادی کو طے کر رہے تھے وہ زمانہ ایسا تھا کہ دہلی سیکڑوں باکمالوں کا مجمع تھا اور دلی ان کی ذات سے مایۂ فخر و ناز بنی ہوئی تھی۔ مومن۔ آشفتہ۔ صہبائی۔ ذوق آزردہ۔ غالب۔ شاہ نصیر۔ رنگین۔ انشا۔ مصحفی ایسے باکمال اپنے فیض کمال سے علمی محافل و مجالس کو آراستہ رکھتے تھے سودا۔ میر۔ درد۔ سوز اور قائم کے رنگ کو بدل کر شاعری کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ پرانے الفاظ اور محاورے شعر سے خارج کر دئے گئے تھے اسلوب بیان میں ایک خاص قسم کی جدت پیدا ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے اس دور میں بجز ان لوگوں کے جو یقیناً اہل تھے کسی کو شہرت نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ میر ممنون کا اس عہد میں مشہور ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ کوئی خاص بات اپنے اندر رکھتے تھے — وہ نہ صرف دربار تک پہونچے بلکہ شاہ وقت کے استاد بنے اور نہ صرف استاد ہی بنے بلکہ پیشگاہ سلطانی سے فخر الشعراء کا معزز خطاب بھی حاصل کیا۔ اور یہ نیکنامی صرف خطاب ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ بڑے بڑے اہل کمال ان کے کمال کے بارہ میں یکدل و یکزبان ہو گئے۔ مصحفی انکو ایک اعلیٰ درجہ کا خوشگو جانتے ہیں بلکہ انکو ان کے باپ کے برابر مانتے ہیں۔ شہزادہ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن میں ان کو ایک طرز تازہ کا مخترع ٹھہراتے ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ جن کی بے پناہ تنقید اچھے اچھوں کو نیچا دکھاتی ہے، متعدد تعریفی جملوں سے گلشن بیخار میں یاد کرتے اور ہر طرح انکی استادی کے مقر رہتے ہیں۔ سر سید مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں کہ سخن میں ایک طرز تازہ ایجاد کیا۔ مولوی عبد الغفور ایسے بیباک تذکرہ نویس بھی لکھتے ہیں کہ شعر ان کے بہت خوب ہوتے ہیں۔ اور تو اور میرزا غالب جب میر مہدی کو خط لکھتے ہیں تو میر ممنون کو کس افسوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ان کے نہونے سے دلی کو ایک ویرانہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "او میاں سیدزادے۔ آزادے۔ دلی کے عاشق دلدادے۔ ڈھئی ہوئی اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔

طرز خاص کے ایجاد کے بارہ میں غور و خوض کے بعد میں صرف اسی نتیجہ پر پہونچ سکا کہ متقدمین کا جو طرز بیان تھا ممنون نے اس کو بدل کر ایک تازہ طریقہ جسپر مومن اور غالب خصوصیت سے کار بند تھے ایجاد کیا۔ فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام کو گل و گلزار بنایا اور معنی آفرینی کے پھولوں سے اس کو چمن زار بنایا اگر غالب کسی طرز خاص کے موجد و مخترع ہیں۔ اگر مومن نے کوئی طرز تازہ اور روش خاص نکالی تو یقینی ممنون بھی موجد ہیں۔

ممنون کی خصوصیات کلام میں سے دو چار باتیں بے شک و شبہہ ایسی ہیں کہ اونکو ان کے معاصرین سے ممتاز بنا دیتی ہیں مثلاً ایک یہ کہ وہ نہایت دقت پسند طبیعت رکھتے ہیں ایسی سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہتے ہیں کہ ذوق اور شاہ نصیر سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اگرچہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا کسی شاعر کے واسطے باعث فخر نہیں ہو سکتا کیونکہ اکثر اوقات ذوق سلیم سے شاعر کو ہٹ جانا پڑتا ہے۔ لیکن ممنون کے ہاں یہ عیب نہیں ہے۔ مشکل سے مشکل ردیف و قوافی میں انکی سیکڑوں غزلیں ہیں اور دیوان میں یہ رنگ عام ہے۔ مگر بد مذاقی کا کہیں نام نہیں۔ سیلاب آتش کا۔ آب آتش کا۔ کس قدر مشکل زمین ہے مگر ممنون اسمیں یہ شعر نکالتے ہیں ؎

نگاہ گرم سے اُسکی دل بیتاب وش ہے   حریف آخر ہوا یہ پارۂ سیماب آتش کا
مرے یہ گرم آنسو پونچھ مت دست حنائی سے   کہ ان آنکھوں سے رہتا ہے رواں سیلاب آتش کا

در حباب کا۔ گر حباب کا۔ ایک مہمل زمین ہے مگر کہتے ہیں ؎

ہر آبلہ ہے دل کا دو چار فغان گرم   سر سر سے یاں مقابلہ ہے ہر حباب کا
دریا میں کون رشک قمر دھو رہا ہے منہ   لبریز ماہتاب سے ہے ساغر حباب کا

اسیطرح ہر ردیف میں مختلف مشکل زمینیں بے تعداد ہیں مگر وہ معاملات حسن و عشق کو نہایت ہی خوبی سے ادا کرتے چلے جاتے ہیں دل نے غش کیا۔ گل نے غش کیا کیسی مشکل زمین ہے مگر وہ ایک نہایت عارفانہ مسئلہ اس خوبصورتی سے کہتے ہیں کہ زمین کے مشکل ہونے کا خیال ذہن سے دور ہو جاتا ہے۔ بتاتے ہیں کہ عشق کا جزو کل کیصورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی ابتدا انتہا ہو جاتی ہے۔ اور اسی اظہار میں مطالب کی تہ میں ظرافت کی غیر محسوس ہلکی سی چاشنی دیتے ہیں۔ طنز کا ایک ستھرا پہلو شامل کر کے شعر کو آسمان پر پہونچا دیتے ہیں ؎

دریا کشی کا مژدہ انہیں ہو جو اہل ظرف   ہم کو تو ایک ہی قدح مل نے غش کیا

ہر زمین کو تشریح کیساتھ لکھنا طوالت مضمون کا باعث ہوگا اس لئے اس قضیہ کو اہل ذوق کی منصفانہ نگاہ پر چھوڑ کر میں چند مشکل زمینوں سے انتخاب کر کے کچھ شعر پیش کرتا ہوں۔

ذرا رو کے یاں جبکہ داماں نچوڑا   ہر اک تار سے ایک طوفاں نچوڑا
گریہ و نالہ کیا ضبط دل نازک میں   ایک شیشہ میں لئے پھرتے ہیں ہم آتش و آب

راحت کہیں نہیں بغلِ گور کے سوا — اڑ جائے زندگی کا الٰہی شتاب رنج
ہے دردناک نا اُمیدیٔ ہجر انکی یہ دوا — ہر چند صبر ہے دل پُر اضطراب تلخ
جاتا ہوں کس گلی سے کہ ہر ہر قدم کے بعد — پھیرے اُدھر کو دیکھے ہے دل بیقرار رُخ

ہے بہت قصۂ ضعف دل رنجور دراز — لب تلک آہ کو ہے آنا سفر دور و دراز
زندگانی میں ہے محسوب اگر روز فراق — عمر رکھتے ہیں بہت ہی ترے مہجور دراز
دمبدم آتا ہے لب پر نالۂ آتش فشاں — تو ہی اس آفت سے ہو یارب نگہدار قفس
بغیر کینہ ست چشم کرم رکھ چرخ گردانسے — بجائے آب دے ناداں ہے اس دولاب میں آتش
آشنا دل سے کچھ خوشی بھی ہے — پر نہایت ہیں درد و غم مخصوص
جا مسیحا نکر درد دل نکر تمنا ہے یہاں — یہ لطف حیات جاودانی میں مرض
لگا دے تیغ یہ دل یہ جگر یہ سینہ ہے — کہ عاشقوں کو کرے زخم امتحاں محظوظ
ہزار طرح کے عقدے پڑے مری دل میں — کھلا نہ ایک ترا عقدۂ نقاب دریغ
کیا دل میں آگ تھی کہ دم نزع جوں چراغ — بھڑکا کچھ اور بجھ بھی گیا ایکبار داغ
کھل گئے آج وہ سب ربط نہاں تھے جو بہم — کس قدر آہ ہوا اس کے ترا نام قلق
وہ درد مند ہوں جو رکھوں سینہ داغ پر — ہو جائے دلخراشیٔ تقدیر سے نمک
ساتھ اپنے گر گیا دل بیتاب زیر خاک — تو ہو چکا نصیب مجھے خواب زیر خاک

اُدھر مژگاں تر ہم شعلہ ریزی تا بکے — جل اُٹھا دامن اُدھر سے اور ادھر سے آستیں
کنج تنہائی میں یہ کچھ شغل رہتا ہے ہمیں — شام تک رہتی ہے آنکھوں پر سحر سے آستیں
سمجھ کر کچھ تڑپنا اے شہید شوق پابوسی — نہ کرنا دامن قاتل کو کچھ بہر خدا رنگیں
غش پہ غش آکے ہے جی جائے ہے کچھ ڈوبا سا — کیا ہوا چارہ گرو نبض مری دیکھو تو
نہو دل کسطرح دل خون آدیں کیونکہ بہر آنکھیں — جو دیکھوں تیرے زانو اور لبوں پر جام و آئینہ
لکھا تھا نشتر مژگان سر مہ سا کا وصف — زبان خامہ سے اب تک واں ہے خون سیاہ
ملتے ہی آنکھ برق سی دل پر چمک گئی — کتنی تری نگاہ فسوں کار گرم ہے

مندرجۂ بالا زمینوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی مشکل زمینوں میں غزلیں موجود ہیں اُنکو دیکھکر ایک منصف مزاج نقاد یہ

دیکھتے ہوئے کہ ذوق مرحوم کو انکی محاورہ بندی اور چند سنگلاخ غزلوں نے اور شاہ نصیر کو صرف ان کے مشکل ردیف و قوافی میں غزلیں کہنے نے استاد بنا دیا میر ممنون کے مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد ہونے کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسپر بھی جب یہ غور کیا جاتا ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق مرحوم ہر جگہ اپنے مذاق صحیح کو اتنا قائم نہیں رکھ سکے اور ممنون نے حسن کے ساتھ ہر جگہ اس کو نباہا تو ان کا رتبہ بلند تر ہو جاتا ہے۔

ممنون کے کلام میں دوسری ما بہ الامتیاز چیز انکی وہ ترکیبیں ہیں جنمیں وہ غالب اور مومن کے ساتھ ساتھ ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ دونوں مشہور ہیں اور ممنون غیر مشہور۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ممنون پر بھی فارسی کا اتنا ہی اثر ہے جتناکہ ان دونوں پر۔ مرزا غالب کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبوں کی خوشنمائی کے سامنے محاورات اردو کی پروا نہیں کرتے۔ انکی شاعری دلی اور لکھنؤ کے روزمرہ کی پابند ہو کیونکہ غالب کی طرح وہ بھی اس کوچہ سے گزرنا اپنے لئے ننگ و عار کا باعث جانتے ہیں جس سے عوام کی آمد و رفت ہو وہ ایک خوددار دل پہلو میں رکھتے ہیں اور چونکہ ان کی شاعری بھی خودداری کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی ہے وہ عوام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں،

خود پسندان فرومایہ کے آگے ممنوں　　　میں نہ زنہار پئے عرض ہنر جاؤں گا

مگر ان کی فارسی ترکیبوں سے یہ دہوکا کہانا ایک خطرناک غلطی ہے کہ وہ محاورات اردو نہیں جانتے۔ نہیں ہرگز نہیں پوری طرح سے اسپر قادر ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی دماغ جب خیالات عالی پیدا کرتا ہے تو ان کے واسطے اسی شان و شکوہ کے الفاظ بھی تلاش کرتا ہے مشاق اور پختہ کار اسمیں کامیاب ہوتے ہیں اور باقی ناکام۔ اور یہیں سے انکی شاعرانہ کجروی کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ خیالات گراں پایہ کے ساتھ اگر الفاظ سبک ہوں گے تو توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بلند مضمون کے لئے ہمیں اسلاف اخیار کے ذخیرہ میں الفاظ نہیں ملتے تو قوت ابداعی اپنا کام کر کے الفاظ تراشتی ہے ناواقفان فن کو اس پر طرح طرح کے دہوکے ہوتے ہیں مگر واقف کار اس کو ایک قوت اجتہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ فلسفیانہ خیالات کبھی محاورات میں ادا نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ مشاق ان کے واسطے دوسری زبان سے مدد لیتے ہیں اول تو یہ قاعدہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جسم و جان روح و پیکر دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ جہاں ایک مشاق کے ذہن میں خیال عالی پیدا ہوا ہوگا۔ وہیں خود بخود پرشکوہ الفاظ بھی سامنے آجائیں گے۔ اور اگر کہیں ضرورت پڑیگی تو وہ تراش و خراش سے کام لیگا۔ انجان منہ دیکھیں گے اور رہ جائیں گے۔ میر ممنون کی خوشنما ترکیبیں دیکھئے۔ ہم ترکیب پر صرف خط کھینچدیں گے۔ جی چاہتا ہے کہ انکی خوشنمائی پر کچھ بحث کریں مگر طوالت مضمون کا خوف مانع ہو آپ خود ہی اندازہ کیجئے:۔

اے آہ بے ادب نہ اسے آگ دے کہ ہے　　　دل جلوہ گاہ پردہ نشینان راز کا

تبسم لب غنچہ کو دیکھ روتا ہوں　　　کہ رنگ ہے یہ اُسی خندۂ نہانی کا

مجھے وداع کرو ہم نشیمنان چمن　　　کہ تخل شعلہ پہ ہے قصد آشیانے کا

ستارہ صبح کا یا عقدۂ آب لطافت ہو　　　ہوا جو تکمۂ الماس زینت اس گریباں کا

نمک ریز سودۂ الماس کو ابو آبیدہ کی
ملا کر زخم دل روکش کیا اس نے نمکدانکا

جگر ہے ٹکڑے ٹکڑے کونسی طاقت یہ ہوں ہم
حریف کاوکاو نشتر و ہمطرح پیکاں کا

بجھا کے سوزن الماس زہر میں لاؤ
کہ یاں ہے دھیان شگاف جگر سلانیکا

ترنم غزل تازہ ساز کر ممنوں
کہ اشتیاق ہے ہر اک کو اس ترانے کا

تا عدم ہے شور اپنی آہ بے تاثیر کا
ہے سویدائے دل عنقا ہدف اس تیر کا

گرم رفتار بیابان فنا کو چاہیئے
کوئی دم آرام کو سایہ تری تلوار کا

چرخ سے کہدو کہ کشتی تھم سکے تو تھام لے
آج ہے طوفاں سرشک چشم دریا بار کا

پہلوے رخنہ رخنہ سے جھلکے ہے داغ دل
ہر روزن میں جلوہ ہے اس آفتاب کا

روکش ہزار لطمۂ صرصر سے ہے مدام
ٹک دیکھیو تو حوصلہ اپنے حباب کا

یاں ہے دل شگفتہ میں سیر کائنات
اے جم کسے خیال ہے جام دو نیم کا

چکے ہے نیم تبسم یہ خونبہا اپنا
ہمارے قتل پہ کیا ہے سبب تامل کا

رکھے ہے رنگ اے ساقی شراب آتش کا
مقطر کیا کیا لیکہ گل شاداب آتش کا

ساتھ بوسہ کے ترے دشنام کا کچھ بھی موقع
آبگینوں کو نہ آمیختہ سم کیجیے گا

برق بیداد نے یکدست جلایا ہیہات
خار صحرا جو مرزق تہی پائی تھا

بیاں سدا کاوش پنہاں سے نہاں ہیں نشتر
ہوا دل یہ کوئی کیسۂ فصاد ہوا

آکے نت اک غم نو یا الم تازہ بسا
سینہ معمورۂ غم دل الم آباد ہوا

ناتوانی سے یہ کاہیدہ ہوئے ممنون اب
ان کو درکار عصائے مژۂ مور ہوا

دشنہ سے سیر کچھ نہوئی کشتگان شوق
دل وقف غمزۂ ستم اندیش ہو گیا

دل کاوکاو غمزۂ پرنیش ہو گیا
یکقطرہ خوں حریف دو صد ریش ہو گیا

رقاص موج بادہ نوا سنج تھے طیور
کل کیا سماں درون گل و خار بند ہو گیا

نہوے بخیہ مرے زخم جگر عیسیٰ سے
مفت فرسودہ سر سوزن تدبیر کیا

نگیا چشمۂ حیواں پہ جو حلق تشنہ
آج منت کش آب دم شمشیر ہوا

نمونہ کے لیے اس قدر ترکیبیں جو صرف ردیف الف کی چند غزلوں سے انتخاب کی ہیں کم نہیں ہیں اسی قسم کی سیکڑوں ترکیبوں سے دیوان ممنون ایوان جواہر نگار بنا ہوا ہے سب کا چننا نہ ہمارے امکان میں ہے اور نہ چنداں ضرورت ہے لہذا چند اُن نادر تشبیہوں کیطرف توجہ کرتے ہیں جو بالکل اچھوتی اور نئی معلوم ہوتی ہیں اور جنھوں نے ممنون کا رتبہ بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ ماہ ہاتھ میں بلور کا ساغر لئے ہوئے ہے

دور فلک میں کسکو نہیں میکشی کا ذوق چلتا ہے ماہ ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

غنچہ غنچہ نہیں ہے بلکہ آہ بلبل کا شعلہ گرہ ہو کر رہ گیا ہے۔

نہیں ہے جلوہ نما غنچہ شاخ پر گل کا کہ ہو رہا ہے گرہ شعلہ آہ بلبل کا

صحن میں جو پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں وہ پتیاں نہیں کسی مست شباب نے شراب پی کر مستی میں پیالے توڑ دیئے ہیں

ہے صحن چمن برگ گل و لالہ سے رنگیں توڑے ترے مستی نے ہیں کیا جام زمیں پر

تکمۂ گریباں کی لطیف تشبیہ۔

ستارہ صبح کا یا عقدۂ لطافت ہے ہوا جو تکمۂ الماس زینت اس گریباں کی

صورت بے معنی کی تشبیہ کس لطافت سے دی گئی ہے۔ ایک عام تشبیہ میں حسن بیان اور زور تخیل نے جان ڈالدی۔

جو نظر آتی ہے صورت ہے وہ معنی سے تہی اس زمانہ میں مرقع ہے جہاں تصویر کا

شمع اک مسافر بے برگ ہے جو گرم روی کے ساتھ منزل فنا کو طے کر رہی ہے۔

کیا الگ محفل ہستی سے عدم تک پہنچی بیکہ اس راہ میں تو بے سر و سامانی شمع

جام مے۔ دراصل جام نہیں ہے بلکہ دودمان رز کا چشم و چراغ ہے

بچ جائے باد حادثہ محتسب سے جام ہے یہ بھی خانوادۂ انگور کا چراغ

اشک شور اور چشم سفید کی عجیب تشبیہ۔

چشم سفید سے مرے گرتے ہیں اشک شور کرتا ہے جوش یار قدح شیر سے نمک

بلبل کے نغمۂ رنگیں سنکر پھول شرما رہے ہیں۔

بلبل سنا سنا کے کرے شعر خوانیاں ہے سر بجیب دیکھ ذرا تو حیائے گل

جذب عشق اور اسکی نازک تشبیہ معہ ثبوت

تاثیر عشق دیکھ کہ بلبل کے واسطے ہر شاخ گل نے ہاتھ پہ گلشن میں کھائی گل

رخسار معشوق پر پسینہ سوکھنے کی تمثیل کس قدر عجیب ہے۔

عرق اُس رخ پہ یوں ہوتا ہے کم آہستہ آہستہ سحر میں ڈوبتے دیکھا ہو جو نے گاہے ثریا کو

داغ کی ستارۂ دنبالہ دار سے تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ہوا ستارۂ دنبالہ دار ہر اک داغ رکھے ہے ربط زبس نالۂ رسا دل کا

اسی طرح ہزاروں نازک استعارے اور تشبیہات ممنون کے دیوان میں ملتے ہیں جنکا انتخاب ایک مکمل کتاب تصنیف کرنے کی استدعا کرتا ہے مگر ہم "داماں نظر تنگ و گل حسن تو بسیار" کہتے ہوئے اُن کے ادعائیہ طرز کی طرف توجہ دیتے ہیں جو اپنی نزاکت کی وجہ سے اپنا آپ ہی

جواب ہے ملاحظہ ہو:--

شمع کو ایک معشوق فرض کرکے کہتے ہیں۔

یکشبہ حسن پہ اب سرکشی اتنی اے شمع
صبح کے ہوتے ہی چہرہ پہ ترے نور نہیں

ایک ہی بات سے چند ادعا کئے ہیں۔

دھویا ہے کس نے منہ کہ یہ ہے لطف آب کا
لبریز رنگ گل سے ہے ساغر حباب کا

دھویا ہے چشم مست کو دریا میں کس نے صبح
گرداب ہوگیا ہے پیالہ شراب کا

دریا میں کون رشک قمر دھو رہا ہے منہ
لبریز ماہتاب ہے ساغر حباب کا

فلک تک شور ہے کس کی خودآرائی و مستی کا
لئے ہر صبح نکلے شاہ خاور جام آئینہ

الٰہی کونسے خورشید طلعت کے مقابل ہیں
رکھیں ہیں اب جو اکثر دیدۂ تر جام آئینہ

یہ رنگ بھی اُن کے کلام میں عام ہے اور ادعا کو تشبیہ سے ملاکر ایسی ایسی گلکاریاں کرنا ان کا ایک معمولی طریقہ ہے۔

میر ممنون کے کلام میں کہیں کہیں لکھنؤ کا طرز بھی شامل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد ماجد میر منت کے ساتھ چند روز لکھنؤ میں رہے۔ چونکہ اس وقت لکھنؤ کی دنیائے شاعری تمثیل اور استعاروں اور زلف چوٹی کے مضامین سے بھری ہوئی تھی اسلئے ان کو بھی وہی رنگ اختیار کرنا پڑا۔ میں کسی خاص وجہ سے مایۂ امتیاز بناکر اس قسم کے کلام کو پیش کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک استاد جسطرف متوجہ ہوتا ہے اپنی قادر الکلامی سے دریا بہا دیتا ہے۔ میر ممنون کے لئے اس رنگ میں کچھ لکھنا ایک نقل سے زیادہ نہیں ہے مگر اس نقل کو اصل کر دکھانا انہیں کا کام ہے۔

وہ زلف اور وہ قد وہ دہاں دیکھ مٹ گیا
زاہد کے دل سے نقش الف لام میم کا

کھولا جو پیچ طرۂ عنبر شمیم کا
مشک ختن سے بھر گیا دامن نسیم کا

کسی کے ہونٹھ کے ہلتے ہی ہم تمام ہوئے
مزا ملا نہ ہمیں گالیاں بھی کھانے کا

کسی کی چشم کا عاشق ہوں ساغر مے پر
کرو تہیہ مرے فاتحہ دلانے کا

سیمیں تنوں کے خلعت زریں کا محو ہوں
نے جستجوئے زر ہے نہ کچھ شوق سیم کا

مشہد پہ اُسکے لانا ہے شمع سبز لازم
جو بے گنہ ہے کشتہ اک سرو شعلہ خو کا

طوفاں اٹھا رہا ہے اب طفل اشک خوں
لڑکا تھا یہ تو اپنے آنکھوں کے رو برو کا

خوشۂ اشک نہیں مزرعۂ دل میں ہم نے
تخم الفت کا جو بویا تھا ثمر ہے اُسکا

داغ دل افروز کو کیا بیم آہ گرم سے
صدمۂ صرصر سے کب گل ہو چراغ آفتاب

نہ ایک رات بھی اس مہ سے بھر سکی آغوش　　کیا ہے آپ کو خالی برنگ ہالہ عبث
انگلیاں مہندی بھری کیا کیا کھٹکتی ہیں پرے　　اس سے بہتر ہے تہ دل بر خون میں خنجر چار پانچ
ہیں یک سرو قامت گلرو کا محو ہوں　　نے گل کی آرزو ہے نہ شمشاد کی ہوس
مرغ پامال ہے یہ اس سے اڑا جائے کہاں　　چھوڑ کر تیرے قدم رنگ حنا جائے کہاں
ہماری تشنہ کامی کو نوید کامرانی ہے　　وہ آب چشمۂ شمشیر آب زندگانی ہے

یہ رنگ گو ممنون کے لئے طغرائے امتیاز نہ ہو مگر اس صورت میں بھی اپنے ستھرے مذاق کو قائم رکھنا انکی استادی کی بین دلیل ہے میر ممنون جس زمانہ سے گزر رہے تھے اس میں اور بھی باکمال موجود تھے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ دوسروں سے انکا تقابل کیا جائے تاکہ دیکھنے والے ہماری رائے کو یکطرفہ فیصلہ نہ سمجھیں اور سمجھ لیں کہ وہ اپنے معاصرین سے کسی طرح کمزور نہیں ہیں۔ انشا کی یہ غزل نہایت مشہور ہے۔

انشا:۔　یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں　　وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
ممنون:۔　اسے کیا خدا کا ڈر ہو جو مثال بیش قرباں　　مجھے ذبح کرکے سمجھا کہ ہوا ثواب الٹا

یہ بہت ممکن ہے کہ بیش کا لفظ آج کانوں کو برا معلوم ہو مگر ممنون کے زمانہ میں عیب کی بجائے یہ لفظ باعث حسن ہو تو عجب نہیں۔ دونوں خیال ایک ہیں خدا معلوم پہلے کس نے کہا۔ اور اگر کہیں ایک ہی مشاعرے میں دونوں پڑھے گئے تو توارد کی عجیب مثال ہے۔ ممنون کی اس زمین میں اور شعر بھی ہیں جو نہایت خوب ہیں۔

جو کیا سوال بوسہ تو ملا جواب الٹا　　مرے منہ پہ ہاتھ مارا بدو صد عتاب الٹا
جو بنائے کار دنیا وہ بگاڑتا ہے ممنوں　　جو رہا سنوارنے میں وہ ہوا خراب الٹا

مرزا غالب کی یہ غزل دل نہیں رہا۔ قابل نہیں رہا مایۂ ناز غزل ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ممنون کی غزل بھی سن لیجئے

یاں ذوق زخم خنجر قاتل نہیں رہا　　دل چاہے تڑپنے کو اور دل نہیں رہا
واحسرتا کہ قاتل بیرحم بعد ذبح　　اک لحظہ پیش دیدۂ بسمل نہیں رہا
اے کاوش خدنگ نگہ رحم کر کہ یاں　　ٹکڑے جگر ہے سینہ میں اور دل نہیں رہا
وا کر چکا ہوں عقدۂ بند نقاب کو　　آخر حجاب پردہ حائل نہیں رہا
کم تاب دل بھی اگرچہ پر کاہ سے وے　　کب برق طور سے یہ مقابل نہیں رہا

مرزا غالب کی یہ غزل ۔ سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں۔ نہایت عمدہ غزل ہے۔ مگر ذرا ممنون کی غزل بھی سنئے

کسدن مری جراحت دل خونچکاں نہیں　　بستر پہ سرخ کب تہ پہلو نشاں نہیں

یہ اگرچہ بہت بلند مطلع ہے مگر مرزا غالب کے اس قافیہ کا جواب نہیں۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں　　گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

انگر زبان کا بہت بہتر قافیہ ممنوں نے کہا ہے۔

غالب:- پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی　　روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

ممنون:- کیا کہئے وہ مزاج تو نازک ہے اور بیاں　　قصہ دراز بخت زبوں اور زباں نہیں

غالب:- ہر رنگ گردش آئینہ ایجاد درد ہے　　اشک سحاب جز بوداغ خزاں نہیں

ممنون:- پژمردہ ایک مشت گیاہ بریدہ ہوں　　آئی بہار پر مری جاتی خزاں نہیں

غالب اور ممنون کی یہ غزل بھی ملتی ہے۔

غالب:- ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں　　غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

ممنون:- چھیلتا زخم جگر کا کوئی انگور نہیں　　ہمت اے ناخن غم تجھ سے یہ کچھ دور نہیں

ان دونوں کی غزلوں میں اور شعر ہم قافیہ نہیں اس لئے .... میر ممنون کے دو شعر لکھے دیتا ہوں۔

تاب ہر چند کہ ہے کاہ سے کم لیکن یاں　　شوق کب گرم مصاف شتر و طور نہیں

ساعد و بازوے قاتل کو نہ کھینچے کھیں　　مشہد عشق ہے یہ ایمیج دستور نہیں

کونسا زخم نمک بند ہے سینہ میں مرے　　کہ وہ لب تشنۂ آب دم ساطور نہیں

میر ممنون اور مرزا غالب کے اتحاد مذاق کے سبب بہت سے مضامین مل جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک کے کلام پر دوسرے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناظرین کی تفریح کے لئے بعض مضمون سپرد قلم کرتا ہوں۔

ممنون:- قتل ہو جہ نکر مجھکو کہیں گے کیا ہوں　　کوئی نہ کوئی تو ذمہ مرے تقصیر لگا

غالب:- دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر　　کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

ممنوں:- رکھ دیجئے قلق میں دم تیغ پر یہ دل　　لیکن خیال بوسۂ ابرو نہ کیجئے

غالب:- دہن شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل　　نہ کھڑے ہو جئے خوبان دل آزار کے پاس

میر و سودا شیفتہ، ذوق، آزردہ وغیرہ کی ہم طرح غزلیں بھی ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں مگر ان کا لکھنا بہت طوالت ہے لہذا اب ہم ممنوں کا وہ کلام پیش کرتے ہیں جو میر درد اور میر تقی میر اور سودا کے رنگ میں ہے اور یہی انکا اصل رنگ اور ان کے لئے مایۂ ناز ہے:-

گماں نہ کیونکہ کروں تجھپہ دل چرانے کا　　جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

وفور گریہ ترحم ہجوم نالہ کرم　　کہ ہے ارادہ اُسے درد دل سنانے کا

ترے وسیلہ سے ہے روشناس صد اندوہ　　وگرنہ کون تھا اے عشق آشنا دل کا

سمجھ کے رکھیو قدم رہروانِ وادیِ عشق　　رواں ہے یاں دمِ خنجر پہ قافلہ دل کا
ناتواں ہمسے بھی دنیاں میں ہیں اے ہمرہاں　　توسنِ عزم کو مت تیز قدم کیجئے گا
برق بیدرد نے یکدست جلایا ہیہات　　خارِ صحرا جو مرا رزقِ تہی پائی تھا
ہاتھ میں جنبشِ محمل کی عناں ہے اپنے　　ورنہ یاں کسکو سرِ آبلہ فرسائی تھا
روبرو ہوتے ہی اس برق بلا کے ممنوں　　نذرِ آتش مرا سامانِ شکیبائی تھا
خاموش ہم زباں پہ لیا تو نے کس کا نام　　دل میں اُٹھی وہ ہوک کہ دم سا نکل گیا
اے وائے سادگی وفا بعد صد فریب　　آج اُسکے جھوٹے وعدے پہ میں پھر سنبھل گیا
تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوں　　وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے
مدت سے آب ہو کے بہا چشمِ تر کی راہ　　ممنوں کیا بیاں کروں ماجرائے دل
ممنوں قضا نے ہمکو دیا کیا بغیرِ دل　　سو وہ بھی نذرِ کاہش و تشویش ہو گیا
ہائے ری بیکسی دامن دیے یاری جیب　　کہ مرا دستِ جنوں بستۂ زنجیر رہا
شغلِ شبِ فراق یہی تھا کہ دھیان میں　　ایک ایک شکن گنا تری زلفِ دراز کا
چھاتی سے قبرِ مجنوں کیا کیا لگا کے رویا　　دل کا بخار بارے کچھ میں نکال آیا
مدت سے تپتے تھے بغل میں خلشِ دل　　پہلو کو جو چیرا تو بجز خار نہ پایا
دی شوقِ رُخِ گل نے یہ تپش کہ قفس میں　　آج ایک پرِ مرغ گرفتار نہ پایا
ہر دم طپشِ دل سے نوا زن ہوں قفس میں　　نالہ نے گذر تا سرِ منقار نہ پایا
جب کیا قہقہہ مانندِ صراحی ہم نے　　گریۂ خوں بھی یہاں ساتھ گلوگیر رہا
اسبابِ عیش جمع ہیں سب کچھ ہے یہاں　　کیا ہوے خرمی دل خرم نہیں رہا
ہیں رواں ناقہ کے دنبال ہزاروں بیتاب　　تم کہیں پردۂ محمل نہ اٹھانا اپنا
اے فوجِ تاک اب سرِ تاراج کس لئے　　تختہ تباہ تو مرے داماں کا ہو چکا
نکلا نہ خندۂ لبِ یک زخم سے بجز دل　　معلوم مجھکو سوز نمکداں کا ہو چکا
ایک دل تھا کہ ذرا اس سے رہتیں تھیں باتیں　　غم غلط کرنیکو وہ بھی نہ رہا یا قسمت
رفتار تری اب دلِ مضطر میں بھری ہے　　آئی ہے قیامت پہ تماشائے قیامت
غالباً گذرے نسیمِ باغ سوئے کوئے دوست　　بوئے گل میں کچھ ملی آتی ہے مجھکو بوئے دوست
نہ سی پہلو کے چاک اے بخیہ گر آج　　نکلنے دے ذرا دودِ جگر آج

منت بخیہ و مرہم دل افگار نہ کھینچ
خون ہونا ز کسی شخص کا زنہار نہ کھینچ

ہمصفیرو کو بکر آتش حسرت پہ کباب
نالہ اس سوز سے اے مرغ گرفتار نہ کھینچ

یاں ہے سر سلسلۂ اہل جنوں ممنوں بھی
قیس آنا نہ سوئے خار مغیلاں گستاخ

باندھ پر۔ دام میں رکھ - یا کر ذبح
آ پھنسے اب ترے بس میں صیّاد

یک نیم قطرہ خوں سے ہو کمتر دل و جگر
ہے تس پہ سو جراحت بیداد کی ہوس

ہم بیزبان اور وہ ممنون بیدماغ
دل میں رہی نہاں دل ناشاد کی ہوس

دل دیوانہ چل بسا شاید
اس گلی میں نہیں ہے آج خروش

کھینچوں نکیونکہ میں نفس خونچکاں کہ آہ
دل ایک لاکھ زخم جگر اک ہزار داغ

وہ تیرہ بخت ہوں کہ ہوئیں سو سحر و لے
چھائی ہوئی گھر میں مرے شام اب تلک

قصور فہم ہے طول امل کیا فائدہ اس سے
جہاں تک ہم رہے بالفرض لیکن یہ جہاں کب تک

دیکھ منہ حسرت دیدار سے رو دیتا ہوں
کہیں ہنستا ہے کوئی یار اگر یار سے مل

اے تند باد آہ بس آہستہ جنبشیں
اوڑتے پھرے ہیں چار طرف پارہ ہائے دل

طپش دل نے نہ چھوڑا کہ کبھی ہم اکبار
لائیں تسکین کیلئے لب پہ ترا نام تمام

ادہر کرم ہو سبکدستی جنوں بارے
کہ تخت جیب و گریباں سے زیر بار ہیں ہم

ہیں ایک کف خاک سر راہ پہ تیری
بیٹھے ہیں دلے منتظر باد صبا ہم

ڈرتا کہ ترا دل نہ دکھے چشم نہ بھر لائے
تابوت پہ دل کے نہ ہوئے نوحہ سرا ہم

جنوں کی سبکدستیوں کی قسم ہے
نچھوڑونگا گردن پہ تار گریباں

وقت نظارہ اک نگہہ آرزو نہیں
جس سے کہ حسرتوں کا ٹپکتا لہو نہیں

جان عزیز پاس کی ہم کو قسم کہ اب
سینہ میں خوں نگشتہ کوئی آرزو نہیں

تیرے مریض غم کی یہ حالت ہے ضعف سے
اک آہ ناتواں بھی کبھو ہے کبھو نہیں

تھا شوق کار فرما محفل میں پر ادب سے
کافر ہوں گر نگاہیں مژگاں تک آئیاں ہوں

دل کیوں نہ تنگ ہووے جب ہر طرف ہے یارب
حرمان و یاس و حسرت سینہ میں جھمگیاں ہیں

ہو نہ ممنون کا قاتل ہی کہ تابوت کیسا تھا
کچھ پریشان سا تھا ایک جواں کہتے ہیں

دل سے طوفان سرشک امڈے ہے ہر چند کہ تھا
ہم کوئی حسرت دل اپنی سنا سکتے ہیں

ہول یہ اٹھتے ہے دل میں کہ اڑا جائے ہے رنگ
گو کیا ضبط پہ کیا حال چھپا سکتے ہیں

سبب جو مرگ مجنوں کا سنا کرتے کہانی میں
مرض ایوا وہ بھی لگ گیا ہمکو جوانی میں

کہا گردوں نے سو فتنے مبارک ہوئیں عالم کو
نکالا جب کہ پردے سے کسی نے روئے زیبا کو

نہیں معلوم ان نے کیا کیا وعدہ کہ سینے میں
کیا ایجاد دل نے محشر یاس و تمنا کو

جلایا داغ دل نے سینہ و جان و جگر دیکھو
جو گھر کا تھا چراغ اس سے پھنکا سب گھر کا گھر دیکھو

ہرے ہیں داغ دل کے ابتلک و زخم آرے ہیں
نہ لگ جائے کہیں ٹک ہاتھ میرے سینہ پر دیکھو

تھی دقت ذبح بوسہ پا دل کی آرزو
خوں ہوگئے بہ جلی ترے بسمل کی آرزو

ہوں کشتۂ رسم و رہِ قربانگہ الفت
مقتول سے واں بازوے قاتل کو دعا ہو

صبا پیغام یہ کہیو ہمارے ہم صفیروں کو
سنا جایا کرو آواز گا ہے ہم اسیروں کو

میں ہوں در کنج قفس زمزمہ سنجان چمن
تم نے آواز بھی گا ہے نہ سنائی مجھکو

گمہ فلک پر کبھی دیر پڑے نگہ وصل کی شب
بسکہ تھی عادت شبہائے جدائی مجھکو

عکس بھی تیرا نہ شوخی سے کہیں ٹھہرا ہو
سخت حیران ہیں آئینہ دکھانے والے

ہمکو رونا آئے ہے ممنون تجھکو کیا ہوا
دمبدم کیوں رنگ پر تیرے بھلا تغیر ہے

....

ملتے ہی آنکھ برق سی دل پر چمک گئی
کتنی تری نگاہ فسوں کار گرم ہے

چشمۂ شمشیر قاتل سے یہاں لیتے ہیں کام
بوالہوس یہاں ہے نہیں تف سبو پھراو رہے

دست بر دوش نفس آتی ہے ابتک تج آہ
حضرت دل زور پر ہے ناتوانی آپکی

وصل میں بھی نگاہ شوق تا مژہ پاش آ نکلی
عشوہ کے اہتمام سے غمزہ کی دورباش سے

میں کہوں تھا دل سوزاں یہ نہ رکھو انگشت
آبلے ہاتھ میں آخر نہ تمھارے نکلے

آئینہ سے جو کہ بگڑے ہے بار بار
اس خود آرا سے صفائی ہو چکی

بخت بد صیاد غافل دام سخت
ہم اسیروں کی رہائی ہو چکی

قبر مجنوں پہ جو گزرا تو صدا آئی مجھے
یوں ہی آوارۂ صد دشت محن ہم بھی تھے

دل ہوا خوں جو کیا مرغ چمن نے کل ہائے
ایک دن بال زن طرف چمن ہم بھی تھے

اک تغافل میں ہو گئی حرماں
دل میں جتنی اُمیدواری تھی

کس کے دل پر رکھا تھا تم نے ہاتھ
رات یاں دل کو بیقراری تھی

نہ ہوا ادا کسی طرح ممنوں
کل تجھے کیسی سوگواری تھی

مے سب کو ملی مگر ہمارے
قسمت میں ہے خون ناب باقی
کیا کیا نہ مجھے کہا ہے اس نے
کوئی بھی نہیں خطاب باقی
کرنے نپائے ایک تبسم کہ بس چلے
جوں غنچہ رنگ گلشن ہستی پہ ہنس چلے

. . . .

اسکی بالیں پر نہ ہو سکتا تھا ہم سے گریہ ضبط
حال ممنوں دیکھ کر اپنی عجب حالت ہوئی
گرد کلفت ہر گھڑی جمتی ہی جاتی ہے یہاں
خاطر نازک نہ ٹھہری شیشۂ ساعت ہوئی
میں نامہ و پیغام سے گزرا کہیں یارب
ٹک قاصد بیچارہ کی اپنے خبر آئے
سخت کچھ افسردہ و دلگیر سے رہتے ہو تم
خیر باشد میر ممنوں تم پہ کیا افتاد ہے
بچھڑ دل ساتھ میں صف مژگاں کی کاوشیں
جو یوں رواں ہے خون کا سیلاب سینہ سے
ممنوں بے اضطراب کا تنہ ہے کیا سبب
کب کا نکل گیا دل بیتاب سینہ سے
رہ و رسم دیار عشق کا کشتہ ہوں سوچے
کہ جسکے قتل کا محضر ہے اسکی ہی گواہی ہے
اب جنبش نفس سے مرے دلکو جنگ ہے
لطمہ ہوا کا شیشۂ خالی پہ سنگ ہے
مست کیجیو غرور کہ یہاں حشیم مور ہیں
وسعت تمام ملک سلیماں کی تنگ ہے
برہنہ پائی نے اپنی رلایا دشت وحشت کو
کہ ہر خار مغیلاں شکل خوں آلودہ مژگاں ہے
بلبل ہی اس چمن سے نہ کچھ نوحہ گر گئی
باد سحر بھی آکے دم سرد بھر گئی
پر درد کوئی شعر پڑھا آہ سرد کی
اس مشغلہ میں رات ہماری گزر گئی
اس سیل اشک کا نہ گھٹا زور اب یہاں
سو بار سے جو آب چڑھی اور اتر گئی
کب کا غبار تھا تجھے مجھ سے بھلا صبا
جو میری مشت خاک کو برباد کر گئی
یہی ہے گر قلق اور یہی کاوش تو ڈرتا ہوں
دل مضطر مبادا چیر کر پہلو نکل آئے
یہ دل بھینکا کہ جان نہیں کچھ خبر مجھے
سینہ میں آکی آگ بھڑکتی نظر مجھے
مرتا ہوں اس نگہ التفات پنہاں پر
جفائے فتنہ کی جو عذر خواہ ہوتی ہے

ممنون ایک نہایت غیور آدمی تھے چونکہ دقت پسندی ان کے کلام کا جوہر تھی اور زمانہ دوسری جانب متوجہ تھا مرزا غالب کی طرح جیسی کہ ان کی قدر ہونا چاہئے تھی نہ ہوئی۔ لوگوں نے حسد و بغض سے ان کے بعض اشعار پر سرقہ کا عیب لگایا یہ اُن پر بہت شاق گزرا اور آخر کار انھوں نے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا اور عمر بھر یہی کہتے رہے کہ ع خود پسندان فرومایہ کے آگے ممنوں میں نہ زنہار پئے عرض ہنر جاؤں گا اور اسی گوشہ انزوا میں آخر ہو گئے۔ ان کا صحیح دیوان موجود ہے مگر افسوس کہ طبع ہونے کی کوئی اُمید نہیں وہ تمام اصناف سخن پر یکساں قادر تھے اور تمام اصناف میں کلام موجود ہے

عبدالباری آسی

نغمہ پرست

وفا و محبت کا ایک تاریخی افسانہ

سارنگ پور، ایک چھوٹا گاؤں، کالی ندی کے کنارے آم اور پیپل کے گھنے درختوں کے سایہ میں آباد تھا - روپ متی اس گاؤں کے ایک ویشن خاندان میں پیدا ہوئی تھی ———— پیدا ہوئی تھی، وہ سیاراؤشناس کی گودوں میں جاکر بڑی ہوتی تھی ——— جوں جوں وہ جوان ہونے لگی - اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلنے لگی اور روز بروز ترقی کرتی گئی -

مگر یہ شہرت اس کے حسن کی نہ تھی اس کی خوبصورتی نے اسے ہر دلعزیز بنایا تھا - اس کی ساحرادائوں نے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا تھا - اس کے رُخ پرنور کی عالمتاب کرنیں اُسے اس قدر زحمت نہیں دے رہی تھیں - اس کا جہاں سوز جمال اس کی شہرت اور تسخیر کا باعث نہ تھا - بلکہ اس کی دلکش موسیقی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا - گرویدہ ہی نہیں بلکہ پجاری بھی - رفتہ رفتہ وہ موسیقی کے نئے نئے رازوں سے واقف ہوتی گئی - رفتہ رفتہ اس پر گانے کے عجیب عجیب بھید کھلتے گئے ——— آخر وہ اس زمانہ کی بہترین مغنیہ بن گئی اسے فن موسیقی میں کمال حاصل ہو گیا ——— اور یہاں تک کمال حاصل ہو گیا کہ لوگ اس کے فن موسیقی کی گہرائیوں تک پہنچنے سے عاجز ہو گئے - اور اس کے مرتبہ کو بہت بلند سمجھنے لگے -

---

باز بہادر ایک طاقتور، دلیر اور بہادر پٹھان نے مالوہ پر حملہ کر کے اس کی حقیقی اور جائز حاکم سے چھین لیا اور سرزمین مالوہ کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا -

جب خونخوار اور دہشتناک لڑائیاں سکون میں تبدیل ہو جاتیں، جب سرگرم حملے اختتام پذیر ہوتے اور جب شاہی فرائض ادا ہو چکتے تو باز بہادر ستار یا بربط اٹھا لیتا - اور گھنٹوں اس میں محو رہا کرتا عجیب عجیب سُریلی اور دلکش تانیں، روح پرور راگ الاپتا اور اکثر تاروں بھری پرسکون اور فرحت بخش راتیں وہ دلکو مست کرنے والے اور عشرت آفریں راگوں میں بیخود ہو کر گزار دیتا -

---

اتفاقاً روپ متی کی شہرت باز بہادر کے کانوں میں بھی پہنچ گئی - اور روپ متی مجسم نغمہ کی لے، موسیقی کا دل افروز راگ بنکر اُسکے قلب پُرسرود کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی - وہ اس کی شہرت کا شیدائی بنگیا - وہ روپ متی کو چاہنے لگا - بغیر دیکھے - وہ عاشق ہو گیا - صرف نام سنکر اس کا شیدائی - اس کی آنکھوں، خیال، دماغ، اور دنیائے آرزو میں روپ متی بس گئی ——— اس کی آہیں بے اثر نہ تھیں بلکہ اس کے عشق کی گرمیوں میں تاثیر کے بے پایاں سمندر موجزن تھے اس کے جذبات میں کشش تھی ——— کشش تھی،

ایسی کشش جو محبت کرنے والے مقناطیسی دلوں میں ہوا کرتی ہے۔

اس زمانہ میں، جبکہ باز بہادر کا دل کشش محبت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مالوہ کی فضا میں ایک حیرتناک انقلاب رونما ہوا، اس انقلاب نے مالوہ کے ساتھ ہندوستان کا بھی رنگ بدل دیا۔ اور ساتھ ہی باز بہادر کی تحریر قسمت میں بھی فطرت نے ایک اضافہ کردیا ——— روپ متی اور باز بہادر کی شادی ہوگئی۔ ساز کو مضراب مل گئی اور مضراب کو نغموں کا خزانہ۔

روپ متی جو کہ نغمہ کی پجاری تھی اور اعماق قلب سے اس کی قدردان —— وہ جو عشق کی راگنیوں میں گم تھی اور تنہا — جو خود بھی مجسمۂ محبت تھی۔ باز بہادر کے ساتھ نہایت آرام اور عشرت سے زندگی کے خوشگوار لمحے گزار رہی تھی۔ موسیقی کی غمگین لے عشرت کا رنگین نغمہ بن گئی تھی۔

باز بہادر نہ صرف روپ متی سے محبت کرتا تھا۔ بلکہ اس کی عزت اور احترام بھی کرتا تھا۔ روپ متی کی ادنیٰ خواہش اور معمولی آرزو کو بھی وہ ایک حکم شاہی اور اپنا فرض سمجھتا۔ روپ متی بھی اس قدر دانا، فہیم اور نکتہ رس تھی کہ کبھی کوئی ایسی ناجائز خواہش یا حرکت نہ کرتی جو اس کے شوہر کو ناگوار ہو یا جس سے اس کے قلب مسرور کو صدمہ پہنچے۔

اس کی زینت، آرائش حسن اور راحت کیلئے پاکیزہ ترین ہیرے، یاقوت۔ نیلم۔ الماس۔ چمکدار موتی اور بیش قیمت مرصع زیور تھے۔ اور نہایت نازک، قیمتی اور زریں ملبوسات اس کے رہنے اور برتنے کے لئے فردوس نما خوبصورت محل اور مشرقی صنعتِ تعمیر کے بہترین نمونے کے قصر فلک بوس تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ روپ متی نے ایک حاکم اور ایک بادشاہ کو جسے ہمیشہ ملکی معاملات سے دلچسپی لینی چاہئے جس کے کان رعایا کے کان ہونے چاہئیں۔ جسے ملک کی حفاظت اور رعایا کی خبرداری کے لئے ایک ان تھک نگہبان، اور ہوشیار محافظ ہونا چاہئے۔ ہاں اسی حاکم اور اسی بادشاہ کو، نغمہ کے زیر و بم نے آوارہ کردیا۔ وہ تقریباً ہر وقت باز بہادر کو اپنے ساتھ رکھتی تاکہ نئے نئے راگ اُسے بتائے اور عمدہ عمدہ گانا سنائے۔ ساحر موسیقی، دلدوز ترنم، رسیلا راگ، جو صدہا برس سے ہندوؤں میں پشت بہ پشت چلا آتا ہے۔

بادشاہ دن بدن ملکی فرائض سے دل برداشتہ ہونے لگا۔ دل برداشتہ اور تقریباً بالکل بے نیاز۔ وہ دربار سے بہت کم دلچسپی لیتا تھا اگر کوئی ملازم کاغذ لیکر حاضر ہوتا تو اسے اور زیادہ ترنم ریزی کا موقع ملجاتا اکثر اوقات کئی گھنٹوں کے بعد اسے معلوم ہوتا تھا کہ وزرا اور دیگر حکام اس کے منتظر تھے اور کام کا وقت گزر چکا ہے اگر کوئی بڑا سفیر کسی اہم معاملہ کے متعلق بغیر ملاقات کئے واپس چلا جاتا۔ تو اس بات کی کوئی پروا نہ کی جاتی لیکن اگر کبھی کبھی دلچسپ راگ یا نغمہ پیدا ہونیکا امکان ہوتا تو بادشاہ صرف اس کے تخیل سے مست ہوجاتا تھا اس کی ہرگز فکر نہ تھی۔ کہ مظلوم اپنی اپنی التجائیں اور درخواستیں حضور میں پیش کرنے کو مجتمع ہیں۔ جہاں تخت شاہی پر منوں گرد جم گئی ہے اور اس کا مطلق خیال نہ کیا جاتا تاکہ وہ مضطرب اور مغموم اپنے بادشاہ کی لاپروائی پر روتے پیٹتے چلے جائیں گے، ہاں یہ کہ طبلہ، ستار،

سارنگی اور ربط جو بہت صاف ستھری، چمکدار اور دلچسپ آواز سے لبریز ہوں - اگر تیار ہوتے تو بادشاہ کی ہستی میں ایک کیف رقصندہ پیدا ہو جاتا بہر کیف ملک بادشاہ کی نغمہ پرستی کی وجہ سے تباہی اور بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا - اس وقت باز بہادر کی حکومت کی ڈور اس کے دیوان کے ہاتھوں میں تھی - گو وہ انتظام اچھا کر رہا تھا - مگر ایسا ہی اچھا کہ رعایا پریشان اور تباہ حال تھی -

---

سات برس اس عیش و راحت میں گزر گئے - سلطنت مغلیہ کے دور دورہ از دار الخلافہ میں جاسوس آ پہنچے اور انھوں نے دربار شہنشاہی میں عرض کی - کہ ایک حکومت بالکل شکستہ حال ہو رہی ہے - کیا دربار کا کوئی بہادر سردار اسے فتح کر سکتا ہے - ؟ ایسا ملک جہاں کا بادشاہ صرف نے نواز ہے جہاں ایک دیوان نہایت بدسلیقگی اور بے ایمانی سے حکومت کر رہا ہے - جہاں کی فوج بوڑھے گوئے کی آواز سے زیادہ ناکارہ ہے - نہ کوئی اس کا جنرل ہے نہ سردار -

آدم خاں، ایک بہادر سردار نے جو اکبر بادشاہ کی فوج میں ملازم تھا - عرض کی کہ وہ یکایک پوشیدہ طور سے جا کر مالوہ پر دھاوا کر دیگا شہنشاہ اکبر نے اس کی التجا کو منظور کر لیا - اور ایک زبردست فوج اس کے ہمراہ کر دی -

---

ایک دن باز بہادر اپنی ملکہ کے ساتھ گانے میں مشغول تھا - کہ یکایک تمام محل میں ایک دہشتناک ہلچل مچ گئی اور لوٹ مار کی آوازیں آنے لگیں - دردناک اور حسرت آگیں فریادیں بادشاہ کو مدد کے لئے پکار رہی تھیں - آوازیں اور قدموں کی چاپ رفتہ رفتہ بالکل قریب آ پہنچیں - اور آخر کار وزرا - امرا اور دیگر حکام اکدم دوڑ پڑے اور گریہ و زاری کرنے لگے " بادشاہ سلامت ہمیں بچائیے - ہمیں پناہ دیجئے - دشمن - دشمن - سڑکوں پر لوٹ مار مچا رہے ہیں " اس کے بعد فریادیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا -

باز بہادر نکل کر باہر آیا - اس کے کانوں میں روپ متی کی شیریں صدا "خدا تمہیں فتح دے" گونج رہی تھی - اُس نے بہت عجلت میں اپنا فوجی لباس اور زرہ بکتر زیب تن کیا - منتشر فوج کو یکجا کیا - اسے حیرت ہوئی - وہ تعجب سے دیکھنے لگا - کیونکہ وہ بالکل مختصر تھی اور بے قاعدہ - لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی —— اب اس کا دل ایک بہادر اور جواں مرد کا دل نہ تھا - اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی کی محبت نے اس کے چاروں طرف ایک جال سا بچھا دیا ہے اور اس سے جنگ اور فتح کی طاقت چھین لی گئی ہے - اس نے غنیم کا مقابلہ کیا لیکن بہت ہی بزدلانہ - اس میں آج اتنا جوش نہ تھا کہ خود بھی دلیری سے بڑھتا اور فوج کو بھی ابھار کر آگے بڑھاتا - اس کی فوج تتر بتر ہو گئی - اور زیادہ تر موت کے گھاٹ اتار دی گئی - اور وہ خود بھی نکل کر جنگلوں کی طرف بھاگ گیا اس کے بعد کسی نے اس کے متعلق کوئی خبر نہ پائی -

---

محل میں خاموشی حکمران تھی - اور روپ متی فاتح شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی - لیکن جب اس نے ایک غیر محرم قدم کی چاپ سنی - جو اُس کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہو گیا : تو وہ خوف و دہشت سے لرزنے لگی - پردہ کھول دیا گیا —

—— ایک طویل قامت، شجاع، طاقتور اور زرہ پوش انسان، جس کا فولادی جسم جنگ کے گرد و غبار سے آلودہ تھا۔ سامنے کھڑا تھا

—— روپ متی مبہوت و متحیر کھڑی، خائف نگاہوں سے ہیبتناک اور پر رعب آدم خاں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے خوف پر مسکرا دیا اور کرخت لہجہ میں کہا۔ "تم خوف زدہ ہو۔؟ لیکن میں تمہیں دیکھکر بیحد مسرور ہوں۔ تمھارا شوہر میدان جنگ سے بھاگ گیا —— آج رات کو تم میرے حرم میں داخل کی جاؤگی" دل شکستہ روپ متی، رنجیدہ اور غمگین، روپ متی نے کوئی جواب نہ دیا وہ سالت کھڑی دیکھتی رہی دوسری مرتبہ پردہ کھینچا گیا —— اور آدم خاں چلا گیا۔ تو وہ زمین پر گر پڑی اور انتہائی حسرت آمیز لہجہ میں کہنے لگی: "پیارے شوہر! کیوں چلے گئے۔ آہ کیوں چلے گئے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ آہ اکیلا اور بے یار و مددگار۔ تمہارے سوا اور کسے میں اپنا سرتاج کہوں۔؟ آہ تم نے کیوں مجھ حرماں نصیب کو اس آفت و مصیبت میں تڑپنے کے لئے خیرباد کہدیا۔ میں تمھاری بیوی ہوں —— میرے شوہر تمھاری وفادار۔ تمھاری عاشق بیوی۔ تمھاری ہمدرد راحت۔ تمھاری غمگسار حیات۔ آہ اگر تم جنت کو سدھارے تو میں بھی اب تمھارے پاس آتی ہوں۔

—— اگر تم زندہ ہو تو کبھی نہیں۔ آہ ہرگز میں دوسرے کی زینت آغوش بننے کی ذلت گوارا نہیں کر سکتی" وہ اس عالم محویت میں بہت دیر تک سربسجدہ رہی۔ وہ آہ و زاری کرتی رہی —— آہ و زاری، نالہ و فغاں۔ اور غم کے آنسوؤں سے منہ دھوتی رہی۔ اس کے قلب و جگر میں اضطراب کا دریا لہریں لے رہا تھا اور وہ شکستہ کشتی کی طرح بہی جارہی تھی —— وہ چونک پڑی۔ کسی اطمینان بخش خیال نے اسے خواب گشتگی سے بیدار کر دیا وہ اٹھ بیٹھی —— مطمئن اور شاد۔ اٹھ بیٹھی اور کھڑی ہوگئی اس کے شبنمی آنسو خشک ہو چکے تھے "میرے سرتاج۔ میں آتی ہوں" اُس نے سرد آہ کے ساتھ کہا اور اپنے ویران اور سنسان کمرہ کی طرف چلی گئی

دن گزر گیا۔ شام ہوتے ہی روپ متی نے اپنی کنیزوں سے کہا قبل اس کے کہ آدم خاں اپنی عروس سے ملاقات کے لئے آئے۔ مجھے ایک شہزادی کی طرح، ایک عالی وقار ملکہ کی طرح اس کے استقبال کو تیار ہو جانے چاہئے۔ کیوں۔؟ کنیزوں نے گردن ہلائی روپ متی نے کنیزوں کو حکم دیا۔ مجھے جلد بہترین لباس اور زر و جواہر سے آراستہ کرو۔ آج رات میں اپنے شوہر کی نظروں میں زیادہ خوبصورت معلوم ہونگی۔

خوفزدہ اور متحیر کنیزوں نے اُسے ہر قسم کی آرائش اور زیوروں سے سنوارا۔ اور اس کی خلوت گاہ کو بھی خوب سجایا۔ خوشبودار پھولوں سے تمام کمرہ کی فضا معطر ہوگئی۔ سہری پر کمخواب اور زربفت کا زریں بچھونا تھا —— اور اس پر حسین روپ متی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ریشم کا ایک باریک نقاب پڑا تھا اور اس کے حسن کی تجلیاں نقاب سے چھن چھن کر سارے کمرے کو بقعہ نور بنائے ہوئے تھیں۔ اور اس پر رنگین فانوس اور شمع کی روشنیاں جھلملا جھلملا کر اپنی گلابی اور سنہری کرنوں سے نور برسا رہی تھیں

آدم خاں محل میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت فوجی زرہ بکتر نہ پہنے تھا بلکہ نہایت قیمتی اور شاندار لباس میں اپنی عروس غمزدہ کو دیکھنے آیا تھا۔ ایسا دلکش اور بصیرت افروز منظر دیکھکر فرط مسرت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اس وفا شعار

کنیز میں کسی قسم کی غم و الم کی نشانی نہ دیکھی اور نہ گریہ و فغاں کی آواز سنی ——— اب پردہ اس کے پیچھے گر چکا تھا ——— وہ مسہری کے قریب پہونچ گیا اور پُرارمان نگاہوں سے روپ متی کو دیکھنے لگا۔ وہ خوش ہوا۔ روپ متی کے پھول جیسے چہرہ پر تبسم کی جھلک تھی اور اس کے نازک لب گلگوں مسکراہٹ کے انداز سے بند تھے۔ لیکن وہ کس قدر خاموش تھی؟ ——— خاموش اور خود فراموش ——— چپ اور انتہائی سکوت میں گم سم۔

آدم خاں نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "پیاری حسین خاتون" اور آگے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو چادر کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ لیکن وہ سرد تھا ——— سرد اور بالکل برف۔ وہ بیقرار ہو کر چلا اُٹھا اور اپنا ہاتھ اس کے سینہ پر رکھا لیکن اُس میں کوئی حرکت نہ تھی ——— گھبرایا اور وحشت زدہ کمرہ سے باہر آیا ——— اور روپ متی سوتی رہی ——— وفا شعاری کی نیند میں کھوئی ہوئی محبت کے خواب میں گم ——— گہری اور راحت دائمی کی نیند ——— زہر پہلے ہی کامل طور پر اپنا اثر کر چکا تھا۔ بعد میں اس کی تکیہ کے نیچے ایک کاغذ ملا۔ جس میں حسب ذیل الفاظ درج تھے۔

"پیارے باز بہادر ——— اب دنیا کی ہر راحت اور ہر عشرت میرے لئے بیسود ہے تمہارے بغیر مجھے کسی چیز میں لطف محسوس نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں زیادہ ٹھہرنے سے سوائے رنج و غم کے کچھ حاصل نہیں۔ اس لئے اب میں آتی ہوں۔ اب میں آتی ہوں"۔

(مختار)

محشر عابدی

بادۂ ناب ۔ مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عـہ/

مطالبۂ فطرت ۔ مجلد اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک بیمثل تصنیف عـہ/

عروس ادب ۔ حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ عـگار/

سالومی ۔ اسکر وائلڈ کا نہایت مشہور ڈراما ترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۲/

تذکرہ بلھے شاہ ۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے۔ قیمت صرف ۸/

بندگی ۔ امام بن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بیمثل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی بینظیر کتاب قیمت ۱۰/

کاس الکرام ۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس موضوع پر پہلی کتاب قیمت صرف تین روپے

خلق عظیم ۔ یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک مکمل مجموعہ مجلد عـہ/

فتنہ خلق قرآن ۔ امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بینظیر محاکمہ قیمت صرف ۱۰/

لسان الغیب ۔ حافظ شیرازیؒ کی سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول تین روپے جلد دوم دو روپے

کلیات نظم حالی ۔ شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام قیمت ۱۲/

نقش ارژنگ ۔ جلال الدین صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ۸/

تاریخ دولتین ۔ جرجی زیدان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ قیمت صرف عـہ/

صحابیات ۔ عہد سعادت کی ۸۵ خواتین کے مستند حالات عـگار/

شاعر کا انجام ۔ حضرت نیاز فتحپوری کا بیمثل فسانہ ۱۲/

انتخاب اودھ پنچ سنہ ۱۸۸۱ء کے اودھ پنچ کی جلدوں کا انتخاب عـہ/

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

لارڈ رپن کا عہدِ حکومت

(مسلسل)

سیلف گورنمنٹ کا مستقبل

برطانوی ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیم خود مختار دیسی ریاستوں کے متعلق چند سطور تحریر کی جائیں۔

سیاسی حالات کا مشاہدہ کرنے والے کو دیسی ریاستوں سے جو دلچسپی ہوگی وہ اپنے دو مقصد رکھتی ہے۔ وہ اول یہ کہ جو تصویر وہ پیش کرتی ہیں اس سے ہندوستان کے گزرے ہوئے ایام کا کسی قدر اندازہ ہوسکیگا (اگرچہ یہ بالکل صحیح نہ ہوگا) اور ہمارے نظام حکومت نے جو اچھی یا بُری تبدیلیاں رائج کی ہیں ان کے مختلف دوروں سے کسی حد تک واقفیت ہوسکیگی۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ ملکی اقوام میں خود اختیاری حکومت کا مادہ کہاں تک موجود ہے۔

جب کوئی شخص کسی دیسی دربار کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے اور آداب و درجات کا مشاہدہ کرلیتا ہے تو وہ گویا قدیم حکومت کی روایت کے بارے میں جس کا مدراس اور بنگال میں عرصہ ہوا خاتمہ ہوچکا ہے، ایک ایسی بات سیکھ لیتا ہے جو سیکڑوں کتابیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی اس کے بعد سے اندازہ ہو جائیگا کہ گزشتہ زمانہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات کس قدر خوشگوار تھے، شاہزادوں کا عام باشندوں سے کس قدر گہرا تعلق تھا اور ہر ذات اور مذہب کو جو مسلمہ درجہ حاصل تھا اس سے بربادی کا کس قدر اظہار ہوسکتا تھا۔ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ہندو برہمن اور مسلمان امرا جیسے دو مختلف عناصر ایک ہی نظام کے ماتحت کیسی قدرتی زندگی بسر کرتے تھے جو ہر قسم کی مخالفت سے مبرا ہوتی تھی اور یہ کہ زندگی کی عملی جد وجہد میں وہ ایک دوسرے کی رائے کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ محض تاریخ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کونسی وجہ تھی جسکے سبب سے لکھنؤ کا ایک مسلمان کسی راجپوت شہزادے کی فوج کا کمانڈر مقرر کردیا جاتا تھا یا نظام دکن کے یہاں کوئی ہندو مدبر وزارت کے درجہ پر فائز ہو جاتا تھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قدرتی قانون خشکی اور تری کے رہنے والوں کو متحد کئے ہوئے ہے جس کے باعث یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ باہمی لڑائیاں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں۔" قدیم ہندوستان کی روایتی زندگی میں حیرت انگیز بردباری برتی جاتی تھی جو اب غیر بردباری میں تبدیل ہوگئی ہے اور ایک قسم کا ایسا مادی استغنا پایا جاتا تھا جسے جنگ یا دیگر خطرات بھی زائل کرنے میں ناکام رہے۔ خالصتہً دیسی عدالتوں کو دیکھنے کے بعد یہ رائے رکھنا ناممکن ہے کہ ہندوستانی حکومت کرنے قابل نہیں ہیں۔ سر سالار جنگ مرحوم لارنس اور ڈلہوزی کے مانند زبردست مدبر تھے اور مرہٹوں میں ایسے وزیروں کی کمی نہیں ہے جو ہر سرکاری عہدہ کے فرائض کو ادا کرنے کے پورے طور پر اہل ہوں۔

ساتھ ہی یہ امر بھی بدیہی ہے کہ قدیم ہندوستان اپنی ذہنی ترقیوں کے باوجود جنکا اندازہ خود مختار ریاستوں سے کیا جاتا ہے موجودہ ہندوستان سے ایک صدی سے زیادہ پیچھے تھا۔ دیسی رئیسوں کے دار السلطنتوں میں ذہنی نشو و نما نہایت ہی کم درجہ پر ہے ان میں نہ تو بڑے بڑے اسکول ہی ہیں نہ پبلک کے لئے کتب خانے موجود ہیں، نہ وہاں کتابیں چھپتی ہیں اور نہ اخبارات ہی شائع ہوتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہر دنیا سے کلیتہً جدا ہیں اور اپنے ہی مقامی معاملات میں غرق رہتے ہیں اور ذہنی لحاظ سے بالکل خوابیدہ حالت میں ہیں۔ بعض دیسی درباروں میں داستان گو تاریخ کے علمبردار نظر آتے ہیں اور درباری شعرا ادبیات کے اور منجم سائنس کے سلطنت کی عام سیاسیات جاہل شہریوں کو متاثر کرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ لارڈ رپن کی داخلی پالیسی سے متعلق گذشتہ موسم سرما میں جو طوفان برپا ہوا تھا، اس سے دیسی ریاستیں بالکل غیر متاثر رہیں اس میں اچھے اور برے دونوں پہلو مضمر ہیں۔

اگر ان کی مادی خوشحالی کا برطانوی ہند سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے متعلق میں یہ کہونگا کہ دیسی رؤسا کے علاقے ہندوستان کے زرخیز ترین علاقہ جات نہیں ہیں اور یہ شبہ اپنے دل سے نہیں نکالا جا سکتا کہ ان کا افلاس ہی سب سے بڑا سبب ہے جسکے باعث وہ الحاق سے مصئون و مامون رہتی ہیں۔ نظام اور ہلکر اور سندھیا کے علاقوں میں ایسے جنگلات کے وسیع رقبے موجود ہیں جو غیر مزروعہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں کے پاس نہ کوئی بندرگاہ ہے اور نہ جہاز رانی کے قابل کوئی دریا ہی ہیں۔ مزید بر آں ان کی مزروعہ زمینیں اول درجہ کی زرخیز نہیں ہیں، برخلاف اس کے راجپوت رؤسا ایسے اضلاع کے مالک ہیں جو بالکل ریگستان ہی ریگستان ہیں لہذا ان ریاستوں کے کسانوں کی مادی دولت کا بنگال والوں سے یا ساحل مدراس کی زرخیز زمین سے مقابلہ کرنا غلط فہمی پیدا کرنا ہے کیونکہ حالات سب جگہ یکساں نہیں ہیں لیکن اگر معمولی زمین کا معمولی زمین سے مقابلہ کیا جائیگا تو میرے خیال میں اس قسم کا تقابل دیسی ریاستوں کے لئے نقصان دہ نہ ہوگا جب میں انگریزی علاقہ سے نظام کے علاقہ میں داخل ہوا تو موجودہ حالات کو دیکھکر میرے دل پر خاص اثر پڑا وہاں کبھی کبھی کاشتکار گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی محنت کی نگرانی کرنے کی ... ہے اور یہ نظارہ وہ ہے جو برطانوی دکھن میں کبھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ نظام کے بعض دیہات میں کم سے کم یہ حقیقت دیکھی ... ہے کہ وہاں کوئی شخص مقروض نہیں ہے۔ اور مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ ایام قحط میں ہز ہائینس کی مملکت میں جس قدر اموات ہوئیں ان سے بہت کم نظام کی سلطنت میں وقوع میں آئیں۔

مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ کسی دیسی ریاست میں ہندوستان کی قدیم کفایت شعاری اپنی اصلی شان میں باقی ہے۔ فری ٹریڈ (آزاد تجارت کے اصول) نے ان کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ ان کی روایتی صنعتیں تباہ ہوگئی ہیں اور نمک کے اجارہ سے انہیں سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ان میں سے بعض میں مالگذاری کی انتہائی انگریزی شرح وصول کی جارہی ہے اور ٹیکس اجناس کے بجائے سکوں کی شکل میں لئے جاتے ہیں جس سے کسان صریح طور پر گھاٹے میں رہتا ہے بہ حیثیت مجموعی حیدر آباد کے علاقہ کی زراعتی حالت مجھے مدراس کے مقابلہ میں قدرے بہتر معلوم ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ سرحد پار کے لوگ نقل وطن کرکے ادھر آرہے ہیں اور کسی راجپوت ریاست کے متعلق مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں برطانوی راجپوتانہ کے مقابلہ میں کم مالگذاری وصول کیجاتی ہے۔

ہندوستان کے بہترین نظم و نسق رکھنے والے اضلاع وہ معلوم ہوتے ہیں جہاں کسی دیسی رئیس کے لئے کسی نہایت قابل اور سمجھدار انگریز کی خدمات حاصل ہوگئی ہوں اور جسے یہ اجازت دیدی گئی ہو کہ وہ آمدنی بڑھانے کی خاطر لگان کا تعین نہ کرے بلکہ رعایا کا حقیقی فائدہ ملحوظ رکھے۔ بعض راجپوتی ریاستوں میں ایسے افسر پائے جاتے ہیں جہاں کی زراعت پیشہ آبادی اگرچہ غریب ہے تاہم دوسرے حصص ملک سے زیادہ خوش اور بشاش زندگی بسر کرتی ہے، اس لئے کہ ایسا افسر اس پریشانی سے آزاد رہتا ہے جو برطانوی علاقوں میں اسے ضلع کی حیثیت و استطاعت سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے خیال میں ہر وقت مستغرق رکھتی ہے اور چونکہ اظہار سختی سے اسے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اسلئے وہ زیادہ مہربانی آمیز جذبات کا استعمال کرتا ہے اور تھوڑے عرصہ میں وہ لوگوں کا محافظ بن جاتا ہے۔ مجھے اعتماد ہے کہ ان تمام باتوں سے یہ مطلب نہ نکالا جائیگا کہ انگریز ہندوستان پر اس کی فائدہ رسانی کی خاطر حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ برطانوی علاقوں میں جو موجودہ نظام قائم ہے اُس کے ماتحت رہ کر ذاتی اغراض اور خود غرض حکومت کے اغراض بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں مثلاً یہ یقینی امر ہے کہ حیدرآباد کے صوبۂ برار نے انگریزی انتظام کے ماتحت نہایت خوشحالی حاصل کی ہے اور اسکی خوشحالی بعینہٖ وہ استثنا پیش کرتی ہے جس سے افلاس کا عام کلیہ ثابت ہوجاتا ہے جو بات کسی قسم کی غلطی کا ارتکاب کئے بغیر بیان کیجا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دیسی ریاستوں کے بہترین نظم و نسق رکھنے والے اضلاع وہ ہیں جو ہندوستان بھر میں اپنے نظم و نسق کے لئے بہترین شمار کئے جاتے ہیں۔

شہری آبادی کے متعلق یہ ہے کہ میں نے جن چند خود مختار دیسی ریاستوں کے دارالسلطنتوں کو دیکھا ہے وہاں مجھے باشندوں کی خوشحالی کی علامتیں نظر آئی ہیں وہ برطانوی حکومت کے ماتحت اسی حیثیت کے شہروں میں مجھے مفقود دکھائی دیں۔ بمبئی کے سوائے جو غیر معمولی طور پر ترقی یافتہ اور خوشحال شہر ہے مختلف صوبہ جات کے بڑے بڑے شہروں کے دیسی حصوں کی حالت بے رونق اور گندی دکھائی دیتی ہے۔ مدراس کا کالا شہر ویسٹ منسٹر کی خراب یاد تازہ کردیتا ہے۔ کلکتہ کے یوروپین مکانات کی شان و شوکت کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کی مصیبت و تباہی چھپی رہتی ہے۔ اندرون ملک کے شہر یقیناً خستہ حالت میں ہیں لکھنؤ اور دہلی جو ایک زمانہ میں نہایت مشہور دارالسلطنت تھے، اب ان کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں جاؤ وہاں لوگوں کے چہروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں کسی مخالفانہ وجود کا احساس ہے گویا کہ وہ کسی مفتوح شہر میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ برخلاف اسکے ہندوستانی ریاستوں کے دارالسلطنتوں میں اس قسم کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا اور انگریزی حکومت سے دیسی حکومت میں جانے پر جو عام تبدیلی معلوم ہوتی ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ حیدرآبادیوں کے چہرے سے بالخصوص یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو تو ملتا ہے اور یہ بات دوسرے، اندرونی شہروں میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی بلحاظ لباس وہ ہندوستان بھر میں خوش پوشاک ہیں۔ اس شہر میں رونق اور شگفتگی معلوم ہوتی ہے اور لوگوں پر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں ہے۔ انگریزی آبادیوں کی اطاعت گزیں خاموشی کے بعد سیاح کو اول الذکر حالت کا مشاہدہ کرنے سے تسکین ہوجاتی ہے۔ ہاتھی، اونٹ، سوار حیدرآباد میں سب چیزیں جاندار اور متحرک معلوم ہوتی ہیں اور وہاں کے بازاروں میں سے گزرتے وقت وہ زمانہ آنکھوں کے

سامنے آجاتا ہے جبکہ ہندوستان دولت اور شان و شوکت کا مرکز بنا ہوا تھا یہ ممکن ہے کہ اس شان و شوکت اور ظاہرداری کی نمائش میں مفلسی بھی پنہاں ہو (اور انگریز کہتے ہیں کہ یہ بات ممکن ہے) لیکن یہ حالت اس سے بہتر ہے کہ کسی قسم کی بھڑک اور شان نہ ہو اور غیر ملکی چھاؤنیوں کے بنگلوں کے سوائے خوشحالی کی علامت کسی اور جگہ موجود نہو۔

بہتر حالت کا سبب معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ جو کچھ آمدنی دیسی دربار لوگوں سے حاصل کرتا ہے وہ لوگوں پر ہی صرف کردی جاتی ہے۔ روپیہ ملک سے باہر نہیں جاتا بلکہ وہیں گردش کرتا رہتا ہے۔

برطانوی ہندوستان میں گورنر جنرلوں اور لفٹنٹ گورنروں کا تماشہ ایڈیکانگوں اور ان کے دوستوں کے سوائے اور کسی کو اچھا نہیں معلوم ہوتا اور آمدنی کا بہت بڑا حصہ ہر سال یونہی ضائع ہوجاتا ہے اس سے اگر فائدہ پہنچتا ہے تو دوسرے ممالک اور وہاں کے رہنے والوں کو۔

دیسی ریاستوں میں انصاف حاصل کرنے کے طریقہ کے متعلق صحیح معلومات معلوم کرنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا۔ لیکن مجھے یہ یقین کرنے میں تامل نہیں ہے کہ برطانوی ہندوستان کے مقابلہ میں کم تشفی بخش ہے۔ جو بات مجھے قابل ترجیح نظر آئی وہ سول عدالتوں کی غیر موجودگی ہے جن کے متعلق زور شور سے یہ شکایت کی جارہی ہے کہ وہ بیاج کو ترقی دیتی ہیں۔ یہ بات دہرانے کے قابل ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف نظام ہی کے علاقہ میں مجھے چند گاؤں ایسے ملے جسکے باشندے قرض سے پاک تھے۔ غالب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قطع نظر اس کے برطانوی انصاف ہر جگہ دیسی انصاف کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجسٹریٹوں اور ججوں کے کاموں پر دیسی ریاستوں میں رائے عامہ کے ذریعہ کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ اس بارے میں دیسی ریاستیں امپریل نظام سے بہت پیچھے ہیں اس لئے کہ ان میں صرف شخصی حکومت کا طریقہ رائج ہے اور وہاں کوئی ایسا نظام موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سرکاری انصاف کی تحقیقات کیجا سکے یا اسکی نگرانی وقوع میں آسکے۔ ہندوستان میں آزادی کے خیالات آہستہ آہستہ پھیل رہے ہیں اور دیسی ریاستوں تک ابھی ان کا اثر نہیں پہنچا

دیسی ریاستوں کے بارے میں (جہاں ابھی تک اصلاح کے نفاذ کے متعلق کوئی آواز بلند نہیں کی گئی) یہ تمام خیالات پیش کرنے کے بعد میں برطانوی ہند کے مسئلہ پر بحث کرونگا۔

قارئین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس سوال کے جواب میں جو کتاب کے شروع میں کیا گیا تھا یعنی یہ کہ آیا انگلستان اور ہندوستان کا باہمی تعلق ہندوستانیوں کے لئے فائدہ بخش ہے یا نہیں اور یہ کہ آیا ہندوستانی بھی اسے مفید سمجھتے ہیں یا نہیں میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ بحیثیت مجموعی یہ تعلق مفید ہے۔

میرے دلائل یہ ہیں۔ اچھائی اور برائی دونوں کو جانچنے کے بعد میں نے ایک جانب یہ بات مشاہدہ کی ہے کہ کسی حد تک انگریزی گورنمنٹ کی خود غرضانہ تجارتی پالیسی کے باعث اور کسی حد تک انگریزی افسروں کی خود غرضانہ فضول خرچیوں کی وجہ سے اقتصادی پریشانی وسیع پیمانہ پر پھیل رہی ہے۔

بعض دیہات میں کسانوں کی حالت ایسی خراب دیکھنے میں آئی ہے کہ ان کی نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی ہے۔ قرض میں ان کا

بال بال جکڑا ہوا ہے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں - دولت محض چند بڑے شہروں میں جمع ہوگئی ہے اور صرف چند مالداروں کے ہاتھ میں ہے. ملکی آمدنی کا معتدبہ حصہ ہندوستان سے باہر خرچ کیا جاتا ہے اور بہت سا روپیہ ان افسران کی تنخواہوں کی صورت میں چلا جاتا ہے جو چھٹی پر چلے گئے ہیں یا پنشن لے چکے ہیں - میں اپنے تئیں یہ یقین دلانے کے ناقابل رہا ہوں کہ ۱۸۸۵ء کا ہندوستان بحیثیت مجموعی اس زمانے سے زیادہ غریب نہیں ہے جبکہ ہم نے ۱۰۰ سال ہوئے اس کی مالیات کا انتظام کرنا شروع کیا تھا - میرا ہندوستانی ماہرین اقتصادیات سے اس بارے میں اتفاق رائے ہے کہ مالیات کا موجودہ نظام درست نہیں ہے، یہ کہ مالگذاری کے ذریعہ بہت بڑی رقم جمع کیجاتی ہے اور یہ کہ موجودہ کثیر آمدنی زراعتی آبادی کی مادی بہبودی کو نقصان پہونچاکر برقرار رکھی جاتی ہے. ملکی قرضہ کی مقدار بھی بہت بڑی ہے اور مستقبل میں مجھے مزید مالی مشکلات نظر آرہے ہیں -

مزید برآں قدیم سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے. مشرق کے سیدھے سادے قانوں کی جگہ مغرب کے پیچیدہ قانون نے لیلی ہے. قرض وصول کرنے کے اختیارات وسیع ہوگئے ہیں اور ان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مقدمہ بازی اور بیاج میں مزید سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں - اس کے علاوہ افسروں کے ہاتھ میں دن بدن زیادہ اختیارات دئے جارہے ہیں اور وہ دن بدن ان اضلاع سے کم دلچسپی لے رہے ہیں جن کا انتظام اُن کے سپرد ہے. قصہ مختصر یہ کہ پرانے نظام میں ایسی جدید باتیں داخل کیجارہی ہیں جو مفید نہیں ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام باتیں غیر مفید ہیں بلکہ یہ کہ ملک کے مناسب حال نہیں ہیں اور اپنی اچھائی کے مقابلہ میں بہت گراں پڑتی ہیں مجھے ہندوستان ایک ایسی وسیع جائداد کے مانند معلوم ہوتا ہے جہاں اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا متعدد تجربات کرنے کے بعد مالدار بنکر اپنے ملک کو سدھارجاتا ہے. ہر چیز نہایت علمی طریقہ سے کیجاتی ہے، ستھری اور نئی حالت میں رکھی جاتی ہے بالخصوص ناظم کا مکان لیکن کھیتوں پر صرف اہل ہنر مزدور کام کرسکتے ہیں. اور وہ بھی بہت اخراجات اُٹھانیکے بعد حالانکہ کثیر رقم ڈبا دی گئی ہے اور حسابات ہیں کہ معائنہ یا جانچ پرتال کی تاب نہیں رکھتے -

باقی ——— باقی

ض - ا - ب - بی اے

اسلامی لغت

مرتبہ سید حامد حسین رضوی (علیگ)

جلد اول طیار ہوگئی ہے جسمیں حرف "ثا" تک تمام وہ الفاظ معہ مکمل تشریح وتفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی، معاشری لٹریچر سے ہے نہایت ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول دو روپے آٹھ آنے

منیجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

کلیاتِ قطب شاہ

رسالہ "اُردو" میں

کلیات قطب شاہ زمانے کی گردش کے ساتھ ایک سیاح کے طور سے مدتوں دہلی اور کلکتہ وغیرہ کی سیر کرتا رہا - مگر قطب شاہی ملک و دولت کے مالک حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر سلطان دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے اُسے اپنا زر خرید بنا ہی لیا - اِسی کلیات پر انجمن ترقی اُردو کے رسالہ "اُردو" (اورنگ آباد دکن) جلد دوم حصہ پنجم بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ریویو ہوا ہے - اس ریویو کے دو حصے ہیں - پہلا تاریخی اور دوسرا ادبی - تاریخی حصے سے سر دست ہمیں کوئی بحث نہیں ہے کیونکہ اسمیں اکثر تواریخ کا اقتباس ہے - ہاں دوسرا ادبی حصہ رسالہ اُردو کے قابل اڈیٹر اور انجمن ترقی اردو کے لائق سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب بی - اے کیطرف سے لکھا گیا ہے - چونکہ اس ادبی حصہ کی اکثر سطریں ذاتی رائے پر مبنی ہیں - اور سطح ظاہر سے ذرا ہٹ کر نظر غور سے کام لیا جاے تو بعض واقعات بھی خلاف حقیقت نظر آتے ہیں - اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اُن غیر صحیح واقعات کی صحت کیجائے تاکہ عوام میں انصاف سے ہٹے ہوے واقعات اصلیت کی جگہ نہ لے لیں اور غیر حقیقی خیالات حقیقت کی صورت نہ اختیار کر لیں -

اس ادبی حصہ کی ابتدا یوں کی گئی ہے -

> "اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنے گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا - لیکن وہ بات چیت کام کاج سودا سلف تک محدود رہی - اہل علم نے اُسے کبھی منہ نہ لگایا اسلئے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کبھی صورت نہ اٹھائی - سب سے اول ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکھنی کہلائی - اور گو وہ عوام سے نکل کر مجلس خاص میں آئی شعرائے دکن جن کے تخیل کی جولان گاہ فارسی تھی - اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہے گا اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی - اسکو ہمارے یہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے - میر صاحب فرماتے ہیں ؎ خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے - معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا - قائم کہتے ہیں ؎ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ - ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی - اس میں دکن کی اسقدر تنقیص مقصود نہیں ہے جسقدر اپنی تعلی منظور ہے ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے - ؎ سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ - ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ"

اس عبارت کا مکمل جواب اس خاکسار نے اپنے ایک مضمون **تحقیق اُردو**[1] میں "پہلے سوال کا جواب" کے عنوان سے مکمل طور پر اور مدلل طریقہ سے دیدیا اور یہاں مختصر طور پر اتنا لکھدینا کافی ہے کہ شمالی ہند میں اُردو کے جنم لینے کی روایت اصلیت سے دور ہے بلکہ اُردو کا اصلی مولد دکن ہے جسکی پوری پوری صراحت حوالہ مذکور میں درج ہے -

[1] یہ مضمون رسالہ تحفہ حیدرآباد دکن جلد دوم ۱۹۱۲ء ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا ہے - عالی رفاعی

غرض میر صاحب کے پہلے شعر کے معنی ظاہر ہیں کہ انھوں نے استاد کو معشوق سے یاد کیا ہے۔ اور قائم کے شعر سے "نے" کے لفظ کی عمر کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتنے دنوں سے شمالی ہند میں "نے" کا استعمال جاری ہے حالانکہ اہل دکن کے مقابل اہل ہند مدعی ہیں کہ "نے" کا استعمال ہماری ایجاد ہے اور بہت پہلے سے ہم اسکے پابند ہیں۔ لیکن تواریخ اور تذکروں کی ورق گردانی بتلا رہی ہے کہ ولی اورنگ آبادی سے تقریباً سو برس بعد قائم چاندپوری کا زمانہ ہے اور ولی اورنگ آبادی کا ایک شعر ہے۔ ف

ولی جن نے نہ باندھا دل کو اپنے نہالان سوں

نہ پایا پھل جہاں میں اون نے ہرگز زندگانی کا

جب شمالی ہند ولی اورنگ آبادی سے پیشتر اردو کا کوئی ضابطہ صاحب دیوان شاعر نہیں پیش کر سکتا تو نے کے استعمال کی سند ولی سے پیشتر کی کہاں پیش کرے گا۔ ایسی صورت میں شمالی ہند والوں کا یہ قول کہ نے کا استعمال ہمارا ایجاد ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ قائم کے شعر میں **غزل طور کیا** کی ترکیب سے اوسوقت دہلی اور نواح دہلی کی مروجہ ترکیبوں کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ولی کے سو برس بعد تک بھی اہل دہلی نے اردو زبان میں کوئی قابل قدر ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ ستی تک خوباں۔ محبوباں۔ وغیرہ ایسے الفاظ میر و سودا اور ان کے معاصرین کے کلام میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ اور نہ صرف میر سودا بلکہ ان میں سے بعض الفاظ مومن غالب ذوق کے دواوین میں موجود ہیں۔

میر صاحب کا دوسرا شعر (سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ؛ ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ) خود اس بات کی گواہی ہے کہ ہندی میں میر کا سخن نہیں چمکا بلکہ دکن میں بھی جو اردو مولد و مصلح ہے میر کا کلام شہرت رکھتا ہے۔

طرز بیان کا قاعدہ ہے کہ کمزور درجہ پہلے اور پرزور درجہ بعد کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ ہی ہیں نہیں مانتے بلکہ سارا شہر مانتا ہے (دیگر) دو چار کیا آٹھ برس بھی مقابل ہو جائیں تو خوف نہیں قائل یوں کہتا ہے کہ صرف ہندی کے باغبان ہمارے سرسبز سخن کے قائل نہیں ہیں بلکہ چمن دکن کے کدیور بھی ہماری آبیاری خیالات کو تسلیم کرتے ہیں اس شعر سے تو دکن کی اولیت اور عظمت خود ظاہر ہے۔

ف ایک لطیفہ یاد آیا (آب حیات تذکرہ سودا) سودا اور فاخر کا جھگڑا طول کھینچا فاخر کے ایک شعر سے گرفتہ بود درین بزم چون قدح دل من شگفتہ روی صبا شگفتہ کرد مرا۔ پر اعتراض کیا کہ قدح کو دل گرفتہ کہنا بیجا ہے۔ اہل نشاط نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہہ دی ہے۔ یا ہنسی سے کہ اسے بھی شگفتگی لازم ہے۔ بقا (شاگرد فاخر جو جواب ادا کرنے مرزا کے پاس آئے تھے) نے جواب میں شاگردی کا پسینہ بہت بہایا۔ اور آخیر کو با دل کا ایک شعر بھی سند میں لائے ع چون نشاط بادہ بخشد بس خراب بے تو بہ دل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو۔ مرزا رفیع سنکر بہت ہنسے اور کہا اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں کے شعر دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے یعنے باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالہ شراب سامان نشاط ہے مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے۔ حالی رفاعی۔

اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ایسے اشعار اشعار تعلی کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے مبالغہ آمیز اشعار سند میں نہیں لئے جاتے کیونکہ تقریباً ہر شاعر اسی قسم کے تعلی آمیز مضمون کہنے کا عادی ہوتا ہے چنانچہ ولی کا ایک مصرع ہے ع ”دبا عرق کے تیج عراقی عراق میں“ کیا یہ امر ممکن الوقوع ہو سکتا ہے ؟ -

اِس کے بعد فاضل مخاطب ولی دکنی کی اولیت کا عام خیال بیان کرتے ہوئے دو تین وجوہ بیان کر کے اُن کی تردید کرتے ہیں -

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ولی ایک زمانے تک پہلا شاعر سمجھا گیا لیکن یہ بات غلط ثابت ہونے پر بھی زبان اور قلم سے ولی کی اوّلیت نکل ہی جاتی ہے اور یہ بات عقیدے میں شامل ہو گئی ہے - ولی اردو شاعری کا نہ آدم ہے جسطرح خیال کیا جا رہا ہے اور نہ فارسی والوں کی وضع سے ردیف وار اپنا دیوان ترتیب دینے والوں میں پہلا شخص ہے کیونکہ ولی سے پیشتر کا قطب شاہ کا کلیات دستیاب ہو گیا ہے ۔“

ولی اورنگ آبادی کی نسبت جو عام خیالات بیان کئے گئے ہیں اور اُن غلط خیال کی تردید کیگئی گو ایک حد تک درست ہے - مگر ولی کو ”آدم شاعری کہنے کی اصلی وجہ بیان نہیں کیگئی - اور اگر اصلی وجہ بیان کیجاتی تو اس کا جواب ناممکن تھا -
انکی اصلی وجہ سننے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضرور ہے کہ اس خیال کے بانی پہلے اہل ہند بھی ہوئے ہیں اور اسکے بعد اس بے بنیاد خیال نے عالمگیر صورت اختیار کر لی اہل ہند کی پیروی کرنیوالے یا غیر محقق اہل دکن نے بھی ولی کو اردو شاعری کا آدم قرار دے لیا -

ولی کو اہل ہند نے اُردو شاعری کا آدم اسلئے قرار دیا کہ جب تک ولی کا دیوان دکن سے دہلی نہیں پہنچا تھا - اسوقت تک نواح دہلی تو خیر دہلی بھی اس وضع کے دیوان سے ناواقف تھی - صرف دوہے اور کبت وغیرہ ہی انکی عین شاعری تھی اور یہی سرمایہ اِس کے بعد جو کچھ سیکھا - ولی کے دیوان سے سیکھا - اور جو کچھ بولے ولی کی زبان سے بولے ایسی صورت میں ولی اِن مقلدوں کا استاد تھا پیر تھا ہادی تھا ؛ اہل ہند کو سب سے پہلے کوئی فارسی وضع کی غزل اور اسی طرح غزلوں سے مرتبہ دیوان نظر آیا تو دیوان ولی ہی تھا - ان کے لئے وہ نئی بات تھی اور نئی چیز ، - اِسی حقیقت کو مدنظر رکھکر انھوں نے ولی کو شاعری کا آدم قرار دیا - اور ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے - انکی نظروں میں اس رتبے اور اس اولیت کا مستحق سوائے ولی اور کون ہو سکتا تھا - اور یہ بات اُن کے عقیدہ میں کسطرح شامل نہ ہو جاتی ؟ (ہونا ہی چاہئے) - یہاں تذکرۂ آبحیات کی چار سطریں نقل کیجاتی ہیں :-

”ولی کی امنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کرنے کو اس کام پر آمادہ کیا جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا - وہ یہی کہ فارسی کے قدم بقدم چلیں اور پورا دیوان مرتب کریں - “

اِس کے بعد پھر لکھتے ہیں - ”غرض جب اون کا دیوان دہلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا - قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا - لذت نے زبان سے پڑھا -

گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے
لگے ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں
دیوان بنانے کا شوق ہوا۔

اب کلیات قطب شاہی کو لیجئے کہ اسکا علم اکثروں کو اب ہوا ہے اور اس نسخے کے ذریعے ہوا ہے جو عمدہ کاغذ پر عمدہ کتابت کیا ہوا خاص شاہی کتب خانے کا تھا۔ لیکن اہل دکن کو اس نسخے کے وجود کا علم ہونے کے پیشتر بھی کلیات قطب شاہ کا علم تھا۔ اور بعض جگہ اس کلیات کی نقلیں موجود تھیں[۱]۔ پھر واقف کار اہل دکن ولی کی اولیت کے کس طرح قائل ہو سکتے ہیں؟

صاحب تبصرہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"ہندوستان ہمیشہ سے پامال السنہ رہا ہے سنسکرت سے لیکر انگریزی تک کوئی
نہ کوئی غیر زبان اس پر مسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گولکنڈہ
میں تھی جہاں سرکاری اور درباری زبان فارسی اور رعایا کی زبان تلنگی تھی
یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا۔ کہ ملک کے آس پاس کی زبان
کنڑی تھی:-"

منقولہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ قطب شاہیہ دارالحکومت کی دفتری اور درباری زبان کا ذکر کیا گیا ہے کہ فارسی تھی۔ عام رعایا کی زبان بھی تبلائی گئی ہے کہ تلنگی تھی اسی طرح عادل شاہیہ کی رعایا کی زبان تو تبلائی گئی ہے کہ ملک کے آس پاس کنڑی تھی مگر عادل شاہی دارالسلطنت بیجاپور کی دفتری اور درباری زبان کا اظہار ضرور رہتا۔

بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ اول کا سنہ جلوس ۹۴۱ھ ہے
گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ کا " " ۹۸۸ھ ہے
" سلطان محمد قلی قطب شاہ کا " " " ۱۰۲۰ھ ہے

بیجاپور میں دفتری اور درباری زبان ۹۴۱ھ سے ریختہ دکنی کر دیگئی تھی تو عوام پر اس کا کیا اثر ہونا چاہیئے۔ وہ ظاہر ہو سکتا ہے اور اور اس سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ ۹۴۱ھ تک ریختہ زبان میں الفاظ کا کتنا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔
دور ایک سلطنت کی درباری اور دفتری زبان بننے کی قابلیت اس میں کتنی تھی۔ پھر معلوم نہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے

"یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی"

لکھ کر عبارت کیوں ختم کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ برہان قطب شاہ کے زمانے کے پیشتر ہی سے بیجاپور میں دفتری زبان ریختہ تھی لیکن اسکا حوالہ درج نہیں کیا گیا۔ جو غالباً عمداً ترک کیا گیا معلوم ہوتا ہے۔

[۱] چنانچہ آج سے بیس بائیس سال پیشتر مولوی عبدالجبار صاحب ملکاپوری بلاری نے اپنے تذکرے محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن میں اس کلیات کا ذکر کیا تھا۔ عالی رضا عفی

اس کے بعد صاحب تبصرہ پھر لکھتے ہیں۔

"یہ دونوں (یعنی تلنگی اور کنڑی) زبانیں دراوڑی ہیں - اور انھیں آریائی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں اس ملک میں جب اردو نے ادبی صورت اختیار کی تو اس کے خدو خال کیا ہوں گے تلنگی اور کنڑی دونو اجنبی اور غیر مانوس ان سے کسی قسم کا میل ہو ہی نہیں سکتا - لامحالہ فارسی کا رنگ اس پر چڑھ گیا - اول تو فارسی آرائی دوسرے صدہا سال کی یکجائی - دونوں ایسے گھل مل گئیں جیسے شیر و شکر -"

اگر غور سے صدر کی منقولہ سطروں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بھاکا کو آریائی اور اس کی ہمزاد فارسی کا آپس میں میل قرار دیکر واقعہ بیان کیا جارہا ہے مگر اس کے متعلق اس خاکسار کے مضمون "تحقیق اُردو" میں صراحت سے جواب دیا جاچکا ہے - چونکہ وہ بہت طویل ہے اسلئے اسکی نقل بھی بیان طوالت کا سبب ہو جائے گی مختصر یہ کہ اس قسم کا خیال رکھنے والے اہل ہند خصوصاً فاضل مخاطب کو اس مضمون پر ایک نظر ڈال لینا چاہیئے پھر ظاہر ہو جائے گا - کہ ریختہ کے جزو اعظم عربی اور مرہٹی ہیں نہ کہ فارسی اور بھاکا — !!

اس کے علاوہ بہمنی دور سے دکن میں ریختہ کا جو ڈھانچہ تیار ہوا اس میں دکن کی مختلف زبانوں کو دخل ہے - اور اتنا دخل ہے کہ جس نے ریختہ کو بھاشا کے مرہون منت ہونے سے سبکدوش کر دیا -

صاحب تبصرہ ص ۱۸ پر لکھتے ہیں - ورنہ جو تھوڑا سا امتیاز اُردو ہندی میں پایا جاتا ہے وہ بھی نہ رہتا "

پھر صاحب تبصرہ ص ۱۹ پر لکھتے ہیں -: - دکن میں جب ہندی نے ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی "

مذکورۂ بالا ہر دو عبارت سے متضاد صورت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ کبھی آپ یہ ایک کلیہ سمجھتے ہیں کہ اُردو اور ہندی علحدہ علحدہ زبانیں ہیں - اور کبھی آپ کی تحریر سے یہ مطلب برآمد ہوتا ہے - کہ ہندی نے دکن میں ادبی صورت پیدا کی - آپ کسی کلیہ پر قائم ہو جائیں تو کہنے والا کچھ کہہ سکتا ہے ورنہ کس پہلو کا جواب دیا جائے صاحب تبصرہ ص ۱۹ پر لکھتے ہیں: - لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں -" (یعنے قطب شاہ کے وقت کی ریختہ میں)

پھر اس کے بعد ہی لکھتے ہیں: - اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے -"

پھر ص ۲۳ پر لکھتے ہیں " غرض کہ اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے اور بجائے ہمدم و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب دوتی، وتن - اور پریم، نیہ، پرت، اور، برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں "

فاضل مخاطب کی طرز تحریر سے ٹپکتا ہے کہ پریم، پرت، برہ، ساجن وغیرہ الفاظ صرف ہندی ہی ہیں - اور اسوقت ہی سے ریختہ میں گنگا جمنی اثر کی جھلک نظر آتی ہے - یہ سراسر خیال ہے - کیونکہ یہ الفاظ ملک دکن کی مختلف زبانوں تلنگی - مرہٹی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں - یہاں مزید صراحت کی غرض سے مختصر نمونے دکھلائے جاتے ہیں: -

اردو	تلنگی	مرہٹی	کنڑی
محبت	پریے ما - پے ما	ممتا	.
شوہر	پرت - پرتلو - برتلو	.	.
کام - دہام - سمار	سمار	سول سار	.
سخی - مالک	داتار	داتا - دہنی	دہرم داتا
خیال یار	دیا ونت	.	.
غور - خیال - فکر	ڈیاں - ڈیانم	دہیاں	چتم
دنیا عالم - چو طرف	جگت	پرتھومی	.
فقیر جوگی	گسائیں	سنت سادہو گسائیں	.
شام کام	انند	.	انندم
دنیا - جگ	جگ	جگت	لوگت
عورت	استری	ستری - نار	.
مست اگن	اگن	سکھی	.
ریت - رسم - وضع	ریت	طرحہ	.
صورت - روپ	روپ	.	.
پانی	نیر	جل	نیر جلم
گناہ - پاپ	پاپ	.	.
رات	رین	راتر	راتری

اردو	تلنگی	مرہٹی	کنڑی
منت سماجت	.	بنتی	.
غذا	انم	انّ	ان
نام	.	ناؤن	ناؤن
سہیلی	.	سکھی	.
اونچا	.	اُونچھ	.
اندھا	.	اندھ	.
رنگ	.	رنگ	.
پر - مگر	.	پٹرہ	.
نہانا - حمام		اشنان	.
نوکر - چاکر		چاکر	.
ہے		آہے	.
بیماری - آزار		آزار - آجار	.
رقم		رکم	.
حفاظت		جتن	.
نقد		نگد	.
کاغذ		کاگد	.
سخت		کٹھنہ	.
ہمیشہ		نت	.

اب یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ آیا بھاکا قدیم زبان ہے یا تلنگی - مرہٹی - کنڑی - قدیم زبانیں ہیں - کیونکہ جل - نیر - سکھی اور روپ وغیرہ یہ الفاظ مشترکہ طور پر بھاکا اور تلنگی وغیرہ زبانوں میں یکساں مستعمل ہیں -

مشاہدات تواریخ نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا ہے کہ تلنگی - اور مرہٹی وغیرہ زبانیں بہت قدیم ہیں - اور اُس زمانے سے ہندوستان میں رائج ہیں جبکہ بھاکا کی ماں یعنے سنسکرت کا بھی ہندوستان میں وجود نہ تھا کیونکہ سنسکرت کا ایرین رہنا تواریخ سے ثابت ہے مگر اس کا ثبوت ہنوز نہیں ملا کہ زبان ایرین کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے یا ایرین کی خاص زبان ہندوستان میں آکر اور منضبط ہو کر سنسکرت سے موسوم ہوئی ہے ؟

اور ایرین ہندوستان میں آنے سے قبل بھی تقریباً دو سو برس پیشتر تلنگی اور مرہٹی وغیرہ زبانیں ہندوستان میں موجود تھیں۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قدیم ریختہ بھی آپکی ہندی یعنے بھاکا کے میل سے بے نیاز رہی ہے اور قدیم ریختہ میں بھی آپ جن الفاظ کو ہندی سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ہندی نہیں ہیں۔ بلکہ ملک دکن کی قدیم مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ الفاظ سے قطع نظر کرکے اب بعض تراکیب کو بھی دیکھ لیجئے

عربی میں انا کا جو محل استعمال ہے۔ تلنگی میں اسی موقع پر باسقاط الف صرف نا مستعمل ہے اور فارسی رفتم گفتیم میں میم علامت واحد متکلم سمجھی جاتی ہے۔ اُسی طرح یوتم تیتم کی میم تلنگی میں بھی واحد متکلم سمجھی جاتی ہے۔ اور جمع متکلم کیلئے جو فارسی لفظ ما ہے تلنگی میں بھی جمع متکلم کیلئے ماہی بولا جاتا ہے اور فارسی والے محل استعمال کے لحاظ سے واحد متکلم کو بشکل اعزاز و غرور جمع تعظیمی ما بولتے ہیں۔ اسی طرح تلنگی میں بھی ویسے ہی موقع پر ما مستعمل ہوتا ہے۔

جستجو کرنیوالے کو اسکے علاوہ اور بہت سی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں[1]

صاحب تبصرہ بھر صفحہ پر لکھتے ہیں۔ لیکن با وجود ان تمام اثرات کے ایک بات خالص ہندی ہے۔ جو

"اسکے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ یعنے بخلاف فارسی شاعری کے عورت کیطرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مرد کو بیوفائی کے طعنے دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے برہ کی راتیں بیقراری میں کاٹتی ہیں۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق یہ ہندی شاعری کا رنگ ہے۔"

شاعری کی اس طرز کو کہ عورت عاشق ہے اور مرد معشوق، آپ ہندی طرز فرماتے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ تلنگی، مرہٹی، کنڑی وغیرہ زبان کی شاعری میں بھی عشق کی ابتدا عورت ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور مرد معشوق قرار پاتا ہے۔ اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو پہلے تلنگی، کنڑی وغیرہ زبانوں سے واقفیت حاصل کیجئے۔ اور ان زبانوں کی شاعری کا گہرا مطالعہ فرمائیے اس کے بعد آپکو سب کچھ علم ہوسکتا ہے۔

بلکہ تلنگی، مرہٹی زبان دانی اردو (ریختہ) کی واقفیت کیلئے ضروری سمجھی جانا چاہئے ہاں شمالی ہند کی موجودہ اردو کی واقفیت کے لئے آپ بھاشا زبان دانی ضروری سمجھتے ہیں تو وہ اور بات ہے۔ اور ایسی اردو جسمیں فارسی، عربی الفاظ کم کرکے بھاکا کے محاورات بڑھا دئے گئے ہیں۔ یا بڑھا دے جا رہے ہیں۔ اردو کیا صرف بھاکا ہی بھاکا رہ گئی ہے۔ ایسی اردو آپ ہی کو مبارک۔

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ زبانیں آپس میں ایک ہیں۔ مگر تقاضائے فطرت اس امر کا متقاضی ہے کہ جنس انسان کے خیالات الفاظ، اور لب لہجہ وغیرہ اگر زیادہ نہیں تو کم سہی گر یگانگت پیدا کرے گو ملکو نہ مقامات کی آب ہوا اور ضروریات مجبور کرتے ہیں کہ اختلاف پیدا ہو۔ لیکن آب و ہوا اور ضروریات سے فطرۃ زیادہ قوی چیز ہے۔ عالی رفاعی

زیر بحث تبصرہ علم کلام کی نظر سے

یہاں طرز بیان اور فن کلام کی تفہیم او صراحت مقصود نہیں ہے لیکن ہر دو رنگ کے بعض اجزا کے متعلق ضروری نکات سے مطلب ہے ہمارا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس فن کے جاننے والے مفقود ہو گئے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ یہ فن اپنے جاننے والوں کی وجہ سے زندہ ہے ہر چند اس فن کے جاننے والے کم ہیں۔ اور حقیقی جاننے والے جنھیں اس فن کا برموقع برتنا آتا ہے وہ بہت کم۔

اس فن کا یہ مقصد ہے کہ قائل کا قول سامع کے ذہن نشین ہو۔ اور اس طرح ذہن نشین ہو کہ اس کا حاصل سمجھ میں آجائے جس نکتہ کو مدنظر رکھ کر کلام شروع کیا گیا تھا۔ وہ باوجود کثرت کلام اور طول بیان کے اصلی مفہوم سے الگ نہونے پائے اور تسلسل بیان باوجود تمثیلات و تحویلات و ملحقات کے اصلی مقصد سے اتنی دور نہ جا پڑے جس سے مرکز فہم غیر ضروری خیالات کا مسکن بنجائے۔

فن کلام میں مکررات نہ صرف حسن کلام کھو دیتے ہیں۔ بلکہ حقیقی مطلب فوت کر دیتے ہیں اور دلبستگی سے بھی علحدہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر بعض ایسے مکررات جو ایک قسم کی متضاد صورت رکھتے ہیں۔ رہی سہی بات بھی ضائع کر دیتے ہیں اور اگر ایسے مکررات کو فن بلاغت کی ایک قسم اطناب کہیں تو بھی ناموزوں ہے۔ کیونکہ اطناب کے معنی مطلب کو وضاحت سے پھیلا کر بیان کرنے کے ہیں۔ نہ کہ مکررات اور مکررات بھی متضاد شکل کے! زیر بحث ادبی تبصرے میں فاضل مخاطب مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر نے جہاں مکررات اور متضاد کی صورت اختیار کر لی ہے اس کے بعض نمونے بھی ہدیۂ ناظرین کرنا مناسب ہے!!

مثال مکررات کی

اتنی سی بات کو کہ۔ اُردو میں ابتدا ہی سے فارسی عروض کی تقلید کی گئی ہے ؛

مکررات میں یوں بیان کرتے ہیں :۔

صـــ پر لکھتے ہیں

تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل اُردو میں بلا تکلف آگئے۔ الفاظ تشبیہات استعارات بنے بنائے تیار مل گئے۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے اور قصیدہ، مثنوی اور رباعی اور غزل میں وہی شان آگئی جو فارسی میں پائی جاتی ہے۔

صـــ پر لکھتے ہیں۔

اور یہ جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے پیش کئے گئے ہیں ان سے فارسی شاعری کا اثر صاف ظاہر ہے خیالات وہی ہیں۔ استعارات و تشبیہات پر بھی وہی رنگ ہے اور بحر بھی فارسی ہیں۔ ،،

صـــ پر لکھتے ہیں۔

تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب فارسی ہیں البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہے؛؛

صـــ پر لکھتے ہیں۔

تمام بحرین (سوائے ایک آدھ کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اُردو نے ابتدا سے یعنے جب سے اسے ادبی حیثیت ملی ہے غیر زبان کا عروض اختیار کیا اگر بجائے فارسی (عربی) عروض کے ہندی عروض ہوتا تو اُردو ہندی نظم اور زبان میں مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہے نہ رہتی۔ یا بہت کچھ کم ہو جاتی۔؛؛

مکررات متضاد کی مثال اور قطب شاہ کے کلیات پر فاضل مخاطب کی رائے

صـ۱۹ پر لکھتے ہیں جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جنکے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اردو کلام پر ہے انھیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت استعارات و تشبیہات کی ندرت تخیل کی بلند پروازی بندش کی چستی نظر نہیں آئیگی۔

صـ۲۰ پر لکھتے ہیں:- اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجے کے شعرا سے کسیطرح کم نہیں۔"

صـ۲۲ پر لکھتے ہیں:- ان اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے جو لوگ قدیم زبان سے واقف ہیں۔ انھیں اس کا خاص لطف آئیگا۔"

صـ۲۳ " " " :- اگر دو ایک شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا جاوے جنکا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے تو ہمارے ہاں کی عشقیہ شاعری میں کوئی بات نئی نظر نہیں آتی۔"

صـ۲۴ " " " :- چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھہ دیا جاوے تو سوائے زبان تغیر و شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔"

صـ۲۴ " " " :- ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے شاعر کے روز کلام اور قوت بیان کا بہت اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

صـ۲۵ " " " :- کیا یہ اشعار اپنے خیالات اور ندرت بیان میں کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں؟"

صـ۲۵ " " " :- (اسی سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے):- علاوہ ان خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو ہمارے شعرا میں عام طور پائی جاتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اردو شعرا میں سوائے سودا اور نظیر کے کسی دوسرے کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت۔ حمد و نعت۔ منقبت و مرثیہ تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں پھولوں میووں پر ہیں۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری کے بیان میں ...... وغیرہ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔"

صـ۲۵ پر لکھتے ہیں:- اور اپنے مشاہدہ کو کلام میں لاکر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جن سے اُردو کے بعد کے شاعر بھی قاصر رہے۔"

صـ۲۶ " " " :- غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابل قدر ہے تبصرہ زیر بحث کی نسبت مجمل اور مختصر طور پر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہدیا۔

اور اب اردو زبان کی اصلاح اور ترقی کیلئے اتنا کہدینا بھی ضرور ہے کہ کسی زبان کی اصلاح اور ترقی اسی ملک کا حصّہ ہے جہاں بادشاہت قائم ہو کیونکہ زبان کی ترقی اور اصلاح کے لئے سب سے اول اثرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ ایک حاکم کی طرف سے رعایا اور ملازمین کا بڑا گروہ رجوعاً اسی اصطلاح یا محاورے کو قبول کرے۔ جو حاکم کی طرف سے بولا جا رہا ہے۔ یا بولنے یا پڑھنے کیلئے کتب وغیرہ میں پیش کیا جا رہا ہے اور دوسری

ضرورت سرمایہ کی ہے ۔ اور ایک شخص یا کمیٹی یا انجمن وغیرہ اتنے مصارف برداشت کر نہیں سکتی جو ایک سلطنت صرف کر سکتی ہے ۔

غرض اصلاح وصفائی اور ترقی اردو کے جو جو لوازم ہونا چاہئیں وہ بحمد اللہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد (دکن) میں کافی طور پر موجود ہیں۔ اور اب سے نہیں بلکہ صدیوں سے اور ہم اردو زبان کے مصلح ہیں ۔ مالک ہیں ۔ اہل زبان ہیں اب ہماری اردو پر نکتہ چینی کرنا خود انگشت نما ہونا ہے ۔ یہ مانا کہ بیجا خود داری کرنیوالا گروہ ہماری اردو پر معترض ہے مگر انکی کوشش بے سود اور ہمارے مقابل بے شمار کی فوج کی سینہ زوریاں جنون آمیز مضحکہ خیز ہیں ۔

عالی رفاعی حیدر آبادی

اب بھی وقت ہے

کہ آپ ظریف شاعرون کا تذکرہ ، نصف قیمت پر حاصل کر سکیں ۔ یہ تذکرہ تقریباً ۰۰۴ صفحات پر شائع ہوگا اوس کی قیمت (للعہ؎) چار روپیہ سے کم نہ ہوگی، لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اسکے پانے کے مستحق ہو جائینگے ۔ یہ تذکرہ اس قدر مکمل، دلچسپ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی ۔

سیکڑون ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطائف وظرائف اور ان کا ظریفانہ کلام جو ہزارون روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آ سکتا، برسون کی محنت وکاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اسے صرف دو روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں ۔ اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہوگی ۔ یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں نیز اشاعت کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا ۔

بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا

مینیجر نگار ۔ نظیر آباد ۔ لکھنؤ

زن مرید

(۱)

اسکی صورت بیحد دلکش تھی بڑی معصوم جیسے باغ ارم کی کوئی خوبصورت کلی۔ اسے دیکھکر کون کہسکتا تھا کہ اس کا دل حریفوں بھونرے کے مانند سیاہ ہوگا

اتنی حسین ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی، اس کمبخت پرستش کے قابل سمجھی جاتی ہے، اس پر یہ تم کہ نئی دلہن، عارف نعیمہ کو دیکھتے ہی شیدائی ہوگئے، بالکل بے خود جیسے چاند کو دیکھکر چکور بے خود ہو جاتا ہے،

وہ ناسمجھ نہیں تھے، نہ جاہل تھے ازدواجی زندگی کے موٹے موٹے اصولوں سے بیخبر بھی نہ تھے شادی سے چند روز پہلے انہوں نے تعلقات زن وشوہر پر ایک مضمون کی کتابت بڑی دلچسپی سے کی تھی "عورت کا تعلق کا ابتدا ہی سب کچھ ہے" اس مضمون کا یہ ایک جملہ تھا جسپر ہوائی قلعہ بنانے میں انکی کئی راتیں صرف ہوچکی تھیں بیوی کے ساتھ میرا کیا طرز عمل ہوگا میں کیسی سنجیدگی کے ساتھ محبت کا اظہار کروں گا کس طرح اسپر اپنی عظمت کا سکہ بٹھاؤں گا وہ کیونکر شوہر پرستی کے طریقوں سے آگاہ ہوگی یہ اور اس قسم کے دوسرے امور پر خوب غور وفکر کرکے انہوں نے حیات ازدواجی کا ایک وقار آمیز لائحہ عمل تیار کیا تھا لیکن وہ پہلی رات ہی کو نئی دلہن کی رونمائی میں ان الفاظ کے ساتھ نذر کر دیا گیا:-

تم کتنی خوبصورت ہو، کیسی پیاری، کسقدر شرمیلی نعیمہ! میرے دل کی ملکہ!! میری طرف دیکھو" نعیمہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی نہ تھی اسے مختصر جہیز ملا تھا اور معمولی زیور، لیکن ڈمیکہ سے ایک اور بھی جہیز لائی تھی سخت مہلک نہایت خوفناک جسے وہ زندگی کا سدا بہار پھول سمجھتی تھی، یہ اسکی نا عاقبت اندیش ماں کی نصیحت تھی نعیمہ بیٹی! جسطرح ہوسکے اپنے میاں کو قبضہ میں رکھنا مرد بس میں ہوتا ہے تو عورت سسرال میں حکومت کرتی ہے" یہ نسخہ اچھی طرح نعیمہ کے دماغ میں اچھی طرح پھیل گیا تھا نعیمہ کی بہت بڑی آرزو تھی کہ عارف اسکے بس میں رہیں سسرال میں اسکی حکومت قائم ہو جائے -

عارف بیتابانہ التجاؤں کا دریا بہا رہے تھے، نعیمہ کے دلمیں مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں، جیسے اسے کسی بڑے دفینہ کا پتہ معلوم ہوگیا ہو، وہ نئی دلہن تھی پہلی رات میں بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھی لیکن بہت سی نا دلمیں اسکی نگاہ سے گذر چکی تھیں وہ جانتی تھی کہ عورت کا پہلا فریب محبت کبھی بیکار نہیں جاتا اسے اظہار محبت کے اور طریقے بھی معلوم تھے، جب عارف کی التجاؤں کا اچھا خاصا ہجوم ہوگیا تو اسنے خاموشی کے ساتھ ان سب کا یک جواب دیدیا، کتنا دلفریب کیسا پرشباب اس نے شرماکر گوری گوری باہیں عارف کے گلے میں ڈالدیں -

(۲)

اب عارف کیلئے دنیا نعیمہ ہی کوئی تھی تھا، دل وجان سے فدا تھے، جیسے شمع پر پروانہ، ماں باپ کا ادب، نہ بھائی بہن کا لحاظ سارا دن اور تمام رات گھر میں رہتے خلوت ہوتی تو اظہار محبت کا طومار باندھ دیتے، جلوت ہوتی تو بیٹھے اسکی صورت تکا کرتے جب وہ نگاہ اٹھا کر دیکھتی یہ نہال ہو جاتے وہ مسکرا دیتی یہ کھل اٹھتے وہ مسکرا دیتی یہ کھل اٹھتے وہ ہنستی یہ کوئی بات آتی یہ دل ہی دلمیں کہتے کیسے پھول جھڑ رہے ہیں ایک منٹ کی جدائی گوارا نہ تھی کبھی دل پر بڑا جبر کرکے باہر نکلتے تو اجازت لیکر بہت جلد واپسی کا وعدہ کرکے نعیمہ نے کہدیا جاؤ دیر ہو گا کہ اس کے دلمیں بیٹھ گئی جو بات کہتی سو کرتے جو کرتی سو ٹھیک غرض انکی محبت کیا تھی ایک طوفان تھا جو شہنا گھر والوں کو تباہ و برباد کردینے والا طوفان! ان کا دل تھا کہ ایک سر منظر

ومضطرب جسطرح چاند کی جانب چکور کی پرواز بالکل ناکام قطعاً مہلک پرواز۔

عارف ایک مشہور کاتب تھے، خوش نویسی میں انہیں اچھا ملکہ حاصل تھا، وہ مصوری سے بھی ذوق رکھتے تھے، مطابع اور جرائد کے مالکان انکی بڑی قدر کرتے تھے، مطبوعات کی اعلیٰ کتابت کیلئے عارف کا نام بہترین ضمانت سمجھا جاتا تھا، شادی سے پہلے وہ ایک ممتاز اخبار میں ملازم تھے لیکن شادی کے بعد مالکان اخبار نے انکی بے نیازی اور دو ہفتہ کی مسلسل غیر حاضری سے تنگ آکر انہیں جدا کر دیا، عارف کو ذرا بھی خیال نہ ہوا کیونکہ وہ معمولی کاتب تھے انکی بحیثیت کتابت کرنیوالے انکی بڑی شہرت تھی، انہوں نے اس فیصلہ کو حقارت کے ساتھ سنا، اور کہہ دیا مجھے اسکی پرواہ نہیں، آج سے ملازمت کی ایسی تیسی جسے سو دفعہ غرض ہوگی میرے دروازہ کی خاک چاٹنے آئے گا، بات غرور بھری ضرور تھی مگر تھی ٹھیک، شروع میں ایسا ہی ہوا، غرض مند گھر بیٹھے کام بلکہ پیشگی دام دیجاتے لیکن عارف کے سر پر تو محبت کا بھوت سوار تھا، کام کون کرتا، تقاضے پر تقاضے کرتے تھے وعدہ پر وعدہ کئے جاتے تھے، جسکا کام لیا وہ رو کر گیا، اور اسے رلا کر دیا، ضرورت مند ضرورت مند ہوتے ہیں پاگل نہیں ہوتے، دام دیں اور کام بھی نہ ہو، تھوڑے دنوں تک یہ رنگ رہا اس کے بعد لوگوں نے اسکی طرف توجہ کم کر دی،

❁

(۳)

نعیمہ کی تعلیم تو کچھ ایسی زیادہ نہ ہوئی تھی تاہم وہ معمولی طور پر لکھ پڑھ سکتی تھی، اُسے ناولوں سے بڑی دلچسپی تھی، اردو رسالوں میں وہ افسانے زیادہ پسند کرتی، یا وہ مضامین، جو مغربی تہذیب کی حمایت میں لکھے جاتے، اسے افسانہ لکھنے کا بھی بڑا شوق تھا، اس کا ایک فسانہ "عورت کی محبت" ایک مشہور رسالہ میں شایع بھی ہو چکا تھا، جس نے اس کے ذوق افسانہ نویسی کا اور بھی اشتہار دیدیا تھا، یہ افسانہ حقیقت میں تو کچھ نہ تھا لیکن مدیر رسالہ کے الفاظ تحسین، عبارت کی رنگینی، اور خصوصاً "مس نعیمہ بیگم" کا نام، یہ چیزیں اُسے لے اڑیں نوجوان طبیعتوں سے خوب داد ملی،

نعیمہ تہذیب جدید کی شیدائی تھی، بڑی بوڑھی عورتوں کو جاہل سمجھتی اور پرانے خیالات کی عورتوں کو دقیانوسی اولاد کہتی، پردہ کی سختیوں سے جلتی، فیشن پر مرتی، بناؤ سنگار سے بہت رغبت رکھتی، کنگھی چوٹی کرنے بیٹھتی تو آئینہ کے سامنے گھنٹوں بال کی کھال نکالا کرتی ساری باندھتی، انگریزی فیشن کا جوتہ پہنتی، حیا نہ شرم، سینہ کا خیال نہ گھونگھٹ کی فکر، بہو کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھکر ساس کے ہوش اُڑ گئے، نئی نئی دلہن، کچھ کہتے ہوئے لحاظ معلوم ہوتا تھا اور بغیر کہے رہا نہ جاتا، کبھی کبھی کہہ دیا جاتا، کبھی نرمی سے سمجھا دیتی، ساس کی نصیحتیں نعیمہ کو زہر معلوم ہوتی تھیں وہ انگریزی بال نہ بنائے، ترچھی مانگ نہ نکالے، ساری نہ پہنے، کسی کے سامنے میاں سے باتیں نہ کرے، اسکی طرف دیکھے بھی نہیں، سر کے بیرون کی چاپ سنکر ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ نکال لے منھ کھولکر باتیں نہ کرے، ہنسنے والی بات پر بھی زور سے نہ ہنسے، چلنے میں جھانجھ اور چھڑوں سے چھم چھم کی آواز نکلنے نہ پائے۔ اس جہالت کا کوئی ٹھکانا بھی ہے، ان باتوں کے لئے کیا کوئی اور زمانہ آنیوالا ہے، کیا وہ جوان نہیں ہے، یا اپنی جوانی کی امنگوں کو کسی کے بڑھاپے پر قربان کردے، پھر کسی جاہل عورت کو کیا حق ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو نصیحت کرے، اس میں نعیمہ کی کتنی سخت توہین تھی، وہ ساس کی باتوں پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی اور ہر دن سوچا کرتی جس گھر کا یہ رنگ ہے وہاں ہماری حکومت کیسی جم سکتی ہے

❁

(۴)

ایک رات جب عارف اظہار محبت میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے، نعیمہ نے کہا "زیادہ محبت نہ کرو لوگ جلتے ہیں۔"

عارف کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے محبت کی شراب چڑھی ہوئی تھی جوش کے ساتھ بولے:۔ جلنے دو نعیمہ پیاری دشمنوں کو جلنے دو!

"وہ نعیمہ بولی :- دشمن نہیں تمہارے بنے نگے،

عارف ذرا چونکے، پوچھا کون ؟

نعیمہ :- تمہارے ماں باپ، تمہارے بھائی بہن، تمہارا سارا کنبہ اور کون "تم نے کیا سمجھا، لیے خدا واسطے کا بیر کس لئے، محبت کے نشہ میں یہ پوچھنے کا ہوش کسے تھا، جیسے کوئی شرابی، ساغر کو لبوں سے لگائے ہوئے لڑکھڑا لڑکھڑا کر بہکی باتیں کرتا ہے، اسیطرح عارف کہنے لگے :- وہ دونوں کے ملنے پر ہم محبت جلتے ہیں، یہ محبت کی توہین ہے، خدا انھیں غارت کرے، کیا اماں بھی جلتی ہیں ؟

نعیمہ نے گردن موڑ کر طنز کے ساتھ جواب دیا، جی ہاں، وہ ... کیوں جلنے لگیں شمی ٹھیک ہی کہتی ہیں گانٹھ تو وہی ہیں، ساری آگ تو انھیں کی لگائی ہوئی ہے ۔ وہ اب بوڑھی ہوئیں، عقل ٹھکانے نہیں رہی، انکی بات کا برا نہ مانا کرو۔

نعیمہ :- چلو بس رہنے دو، پاگل نہیں ہیں وہ بوڑھی ہیں کہ جوانوں کے کان کاٹتی ہیں، ابھی کل کی بات ہے تمہارے ابا جان نے تمہیں پوچھا وہ کام پر کیوں نہیں جاتے، تڑاق سے بول اٹھیں، جائیں کیسے، بیوی نے تو پلو سے باندھ رکھا ہے، پوچھو یہ خدا واسطے کا بیر مجھ سے کیوں ہے، میں نے کیا کسی سے کہہ دیا ہے کہ گھر میں بیٹھے میری صورت تکا کرو۔

عارف دل ہی دل میں جھلا رہے تھے، کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں یہ جھمیلا کمبخت بیچ میں کہاں سے نکل آیا، وہ ٹالنے کے طور پر کہنے لگے :- ہوگا بھی جانے دو، جاہل ہیں، کوئی بات منہ سے نکل گئی ہوگی۔

نعیمہ :- کوئی بات ابھی میاں روز یہی رنگ ہے، دیکھتے دیکھتے دل خون ہوگیا۔ سنتے سنتے کلیجہ پک گیا، میں تم سے کیا کہوں، انھیں تو جیسے ہول دل ہوگیا ہو، جس سے دیکھو اس سے یہی دکھڑا رو رہی ہیں، "مودی مہترانی" اسکی کیا اوقات ایک دن اس سے ہی تمہارے بارے میں کہنے لگیں، جورو کے مرید ہوگئے ہیں، کمائی نہ دھمائی نکھٹو بنے گھر میں پڑے رہتے ہیں "

عارف کو ایک مہترانی کے سامنے کیسا ذلیل کیا گیا تھا، یہ ماں تھی یا دشمن، اس بات پر انھیں بڑا غصہ آیا، لیکن وہ پیچ و تاب کھا کر خاموش رہ گئے، نعیمہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

ابھی اسدن جب تم مٹھائی لینے بازار گئے تھے پڑوس کی بڑھیا آئی، سارے زمانے کی لتری کٹنی حرامزادی، باتوں میں تمہاری کوئی بات چلی تو بس کہنے لگیں میاں بیوی نہیں ہیں عاشق و معشوق ہیں، لیلیٰ مجنوں، حیا شرم تو دونوں نے جیسے گھول کر پی ڈالی ہو، دن ہے تو کمرہ بند، رات ہے تو کمرہ بند، تو بچ کوئی ایسا بے غیرت ہو۔ دنیا میں اور بھی تو جوان ہیں، بہن تم نے دیکھا ہوگا، ہماری بھی تو کبھی جوانی تھی، کسی کو کانوں خبر نہ ہوتی تھی، بھاڑ میں جائے ایسی جوانی، توبہ توبہ" بتاؤ یہ مر جانے کی جگہ ہے یا نہیں، ہم سے تو یہ باتیں نہیں سنی جائیں گی، اتنے دنوں میں تو انھوں نے مجھے طعنوں سے چھید ڈالا۔ کلیجہ میں اب جگہ نہیں رہی، بس للہ تم مجھے میرے میکے پہونچا دو" آخری جملہ کے ساتھ نعیمہ کے گلابی رخساروں پر آنکھوں کے موتی ڈھلک آئے، عورت کے فریب میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کبھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا، عارف بیتاب ہوگئے نعیمہ کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے :-

رو نہیں پیاری، میں تمھیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، دیکھو میرا دل سینہ سے باہر نکلا پڑتا ہے۔

نعیمہ نے جو تیر چلایا تھا، وہ ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا، یہ دیکھکر اسے کیسی خوشی ہوئی، اگرچہ یہی عورت مسرت پر غم کا پردہ ڈال سکتی ہے اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا: آہ ... یہ رونا تو عمر بھر کا ہے، آج تم نے آنسو پونچھ لئے۔

اب عارف کس طرح صبر کر سکتے تھے؟ انکی نئی دلہن کے نازک دلکو بڑا صدمہ پہونچا! گیا سارا قصور انکی ماں کا ہے، اس جرم کو بیوی کے آنسوؤں نے کتنا سنگین بنا دیا! جیسے اس ڈائن کا گناہ جو دوسروں کے بچے کھا کر اپنی اولاد کی تباہی کا باعث بنتی ہے، نعیمہ سے دشمنی کرنا خود نعیمہ کے حق میں کانٹے بونے سے کم نہ تھا۔ غم و غصہ کی ملی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، کہنے لگے: کیسی باتیں کر رہی ہو، تم سے کون آدھی بات کہہ سکتا ہے صبح ہونے دو میں اس ڈربے ہی میں آگ لگائے دیتا ہوں۔

(۵)

عارف نے سچ مچ ڈربے ہی میں آگ لگا دی، وہ ماں باپ سے علٰحدہ ہو گئے اس میں کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں تھی، یہ محبت کا امتحان تھا، نعیمہ کی مراد پوری ہو گئی، ابھی تک عارف دوسروں کے ہاتھ میں تھے اب صرف اسکے بس میں رہیں گے۔ آج وہ گھر کی مالک ہے! بالکل خود مختار۔ نہ ساس کا دھڑکا نہ سسر کا ڈر! اسے کتنے دنوں میں بعد کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا، وہ بہت خوش تھی، جیسے کوئی قیدی کال کوٹھری سے چھوٹا ہو۔
مگر عارف بہت پریشان تھے، کیا انھیں ماں سے جدا ہونے کا رنج تھا جسنے کتنی مصیبتوں، کتنی منتوں، کتنے ارمانوں کے ساتھ انہیں پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا یا باپ سے علٰحدہ ہونے کا صدمہ تھا جس نے کیسی شفقت، کیسی توجہ کیسی محنت سے انھیں اس قابل بنایا تھا، یا پھر اس گھر کے چھوٹنے کا افسوس تھا، جہاں پیدا ہوئے پروان چڑھے بیاہ شادی ہوئی، نہیں، انھیں ان باتوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا، بیوی کی محبت اتنی ذلیل نہیں ہو سکتی تھی ساری پریشانی خرچ کی تھی۔ کام کہیں ملتا نہ تھا، کسی پر ان کو بھروسہ ہی نہ رہا تھا، قرض سے زندگی بسر نہیں ہو سکتی، اب دوست احباب بھی منہ چرانے لگے تھے، ضروریات کس طرح رک سکتی تھیں، صبح کیوقت دودھ جلیبیوں کا ناشتہ نہ ہوتا تو نعیمہ بیگم کے حلق میں دن بھر کانٹے پڑے رہتے، ایکدن ناغہ ہو گیا تھا تو بیوی نے بڑے تڑسے کہدیا تھا، جیسے کہ برتے پر ہوئے ہو۔ کھانے میں دال اسے وبال تھی، دونوں وقت گوشت نہ ہو تو نوالہ اٹھانا حرام۔ پہننے میں موٹی ململ کھارو سے بدتر، جکن، گلبدن کے بغیر چین نہیں، سنگار دان میں کوئی چیز کم ہو گئی بس سہاگ اجڑ گیا، کسی ناول کی تعریف کانوں سے سنی یا آنکھوں سے دیکھی، اب اس کے پڑھے بنا بے کل ہے، آزادیٔ نسوان کے حامی دو رسالوں کی خریداری تو می فرض اور ایک انجمن خواتین کی رکنیت کا چندہ پہلی تاریخ کو بھیجدینا لازمی تھا عارف کی جان بڑی الجھن میں تھی، مگر نعیمہ کو اسکی کیا پرواہ، کوئی لڑکی اپنے پیاروں کو مصیبت اٹھانے کے لئے نہیں چھوڑتی، اسکی جوتی کو کیا غرض پڑی تھی کہ دو دکھ کے ساتھ فکروں میں اپنی جان گھلایا کرے۔
ایک روز عارف بہت متفکر تھے، نہ جانے نعیمہ کو خدا کا کیا خوف آیا کہنے لگی آج تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو؟
عارف جیسے منتظر ہی تھے، بولے کچھ نہیں! اسدن تمھیں جڑاؤ ٹونگے بہت بھلے معلوم ہوئے تھے، میرے پاس کچھ تھا نہیں، ایک دوست سے قرض لیکر خرید لئے تھے، آج کا وعدہ ہے بیسوں تدبیریں سوچتا ہوں مگر بے سود۔

نعیمہ نے پوچھا "پھر؟" جیسے اُسے بڑی ہمدردی ہو۔
عارف کہنے لگے:۔ کوئی صورت نہیں نکلتی، . . . . (ذرا رک کر) برا نہ مانو تو ایک بات کہیں مناسب سمجھو تو اپنے ہاتھوں کے کڑے دیدو، بس دس دن میں آجائیں گے، اسوقت بات رہ جائیگی۔ کڑے کا نام سنکر نعیمہ چونک پڑی، جیسے کسی نے اسکی طرف گولی چلائی ہو، اور بولی کیا کہا کڑے؟ یہ کڑے تو اماں نے بڑی مصیبت سے بنوائے ہیں، تم چاہو تو اپنی دی ہوئی انگوٹھی لے سکتے ہو اور ہاں دیکھو، بات پر بات کہی جاتی ہے تمھیں اپنے دوست کے وعدہ کا تو اتنا خیال ہوا

اور اسدن جب مین چولھے کے سامنے آگ سے تر کر پسینہ مین شرابور بیٹھی ہوئی اور درد کے مارے میرا بھیجا گرا پڑتا تھا اسوقت تم نے سر دباتے ہوے کہا تھا نعیمہ پیاری! بس کل ہی تمہارے لئے کوئی چھوکری لا دونگا،“ آج کتنے کل ہو چکے ہیں، نعیمہ پیاری اب بھی روز چولہا دھونکتی ہین اور چھوکری حرامزادی آرہی ہے، اب آئے یا جائے جہنم مین، بس صاف صاف کہے دیتی ہوں، سچ سچ یہ چولہا برتن نہین ہو سکتا،

کیوں نہیں ہو سکتا؟“ تم کہاں کی نواب بیگم ہو، بڑی بڑی رئیس زادیاں کرتی ہین، وقت پڑتا ہے تو جو پہلی نہیں ہو سکتی تھیں وہ دہان کوٹتی ہین“ اتنی بات کہنے کی جرأت کسے تھی بیوی کے غصہ پر بھی پیار نہ آیا تو وہ محبت ہی کیا، عارف نے ہنسکر کہا: ”بہت اچھا سرکار ناراض کیوں ہوتی ہو، تم سے نہیں ہو سکتا تو میں خود ہی کر لیا کرونگا۔ چھوکری بھی جلد آجائے گی“۔

(۶)

جب پڑتی ہے تب حقیقت کھلتی ہے اس زمانے میں زر کے بغیر عشق بھی نہین کیا جا سکتا یہ سبق عارف کو بہت جلد مل گیا، وہ اچھے کماتے تھے، کام ملنا انہین کیا دشوار تھا، یہ پریشانی خود ہی مول لے رکھی تھی، جب تک تقدیر کو کوستے رہے کچھ نہ ہوا اب اپنی حماقتوں کی خبر لی تو معقول آمدنی ہونے لگی۔

دو میاں بیوی مہینہ میں ساٹھ ستر دیے، کم نہیں ہوتے کوئی سلگھڑ ہوتی تو سونے کی اینٹیں گڑھوا لیتی مگر نعیمہ بیگم کو سارا مہینہ جھینکتے ہی گذرا آج آٹا نہین ہے کل گھی ختم ہو گیا، پرسوں لکڑیاں نہیں رہیں، چولھے میں کیا ہاتھ پیر کاٹ کر جھونکے جائیں گے۔ دیکھو جی تم سے میرا خرچ نہیں اُٹھ سکتا تو صاف کہدو، مین ابھی اپنے میکہ چلی جاؤن۔ یہ ترس ترس کر زندگی کاٹنا مجھے گوارا نہین ہے،

جب نئی نئی محبت کا جوش تھا اسوقت نعیمہ کے احکام معشوقانہ ناز و انداز تھے، اسکی جھڑکیں کیسی پیاری تھیں، اسکی باتیں کتنی رسیلی تھین، اب انہین باتون پر عارف کو رنج ہوتا تھا، زیادہ صدمہ انھین نعیمہ کی خود مختاری اور مجبوری کا تھا، مین اسکی نگاہوں میں کسقدر ذلیل ہوں، وہ میری باتون کو کیسی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتی ہے۔ اسکے احکام میں میرے لئے کتنی بے عزتی ہے۔ انکے دلمین جب یہ خیالات آتے تو کلیجہ میں تیر سے لگتے تھے مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ آقا کو فرمانبردار بننا، حکومت سے بغاوت کرنا، آسان کام نہین ہے، انہون نے اپنے واضح اعمال سے نعیمہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا،

کہاں جاتے ہو۔ کیا کام ہے کب تک واپس آؤگے، جب تک نعیمہ کو ان سوالات کا اطمینان بخش جواب نہ مل جاتا اسوقت تک عارف کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، بس کبھی نہ جانے دونگی، یہ فیصلہ جب اسکی عدالت سے صادر ہو جاتا تو پھر کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہوتا عارف کو اسکی خلاف ورزی کی مجال نہیں تھی، بیوی کے علم و اجازت بغیر اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی میں سے کچھ صرف کرنے کا انہین حق نہ تھا غرضیکہ وہ اپنے ہی گھر میں ایک غلام کی مانند محتاج تھے،

جو تھا بجھا پڑا ہے، بیٹھے ہوے دیکھ رہے ہیں، میں دوپٹہ میں بیل ٹانک رہی ہوں اتنا نہیں ہوتا ذرا اُٹھکر دو پھونک مار دیں“ وہ بنئے ہیں موئے جیٹھ (سل پر بٹہ مار کر) بھاڑ میں جائیں، ہم سے نہیں پستے، جیسے لائے ہو ویسے پیسو، جب کوئی خادمہ نہین تھی تب نعیمہ کا یہ رنگ تھا، اب کام کرنے کیلئے ایک لڑکی رکھ لی گئی تو یہ نقشہ بدلا،“ انہیں دو قدم اُٹھکر پانی پینا دشوار ہے، اب پاخانہ میں لوٹا بھی اسی سے رکھوانا، حکومت جتانے کا ایسا ہی شوق تھا

ہے تو ایک نوکر کیوں نہیں رکھ لیا جاتا چل ری سلیمن تو مصالحہ بین ہانڈی کو دیر ہو رہی ہے، جب پیاس ہوگی آپ اٹھکر پی لے گا۔

احباب کے ہیاں جانے، یا اُن سے ملنے کی عارف کو اجازت نہ تھی، اور کبھی کوئی شامت کا مارا دوست ملنے کیلئے خود ان کے گھر پر آگیا، تو اسے بیٹھے ہوے ابھی دو گھڑی نہیں گذریں کہ نعیمہ بیگم کا مزاج برہم ہوگیا: "گھربار سے نکالے ہوے نگوڑے نجانے کہاں سے آمرتے ہیں، اور پھر ایسے جم کر بیٹھتے ہیں کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں، دیکھ تو سلیمن یہ باہر کیا کر رہے ہیں، ذرا یہاں بلا تو لا"

نعیمہ کا میاں پر تو کوڑا تھا اور خود بالکل آزاد رہتی، جہاں جاہتی جاتی، جسے چاہتی بلاتی، بے غرض بے سود ڈولی منگا میکہ میں حاضر کیہ بلا کسی سہیلی کے ہیاں موجود، عارف کو دم مارنے کی مجال نہ تھی، اسکے سخت تیوروں سے اِن کا دل ہل اٹھتا تھا، کہتا کون کہ نیک بخت تم سے کس خدا نے کہا ہے کہ جہاں جی چاہے چلی جاؤ، جو مزاج میں آئے کرتی رہو ایک صبح عارف بیٹھے کتابت کر رہے تھے، نعیمہ اپنے تازہ افسانہ نئی دلہن پر نظرثانی کر رہی تھی، اس افسانہ میں اس نے یہ دکھایا تھا کہ نئی دلہنوں پر رسم و رواج کے کیسے شدید مظالم توڑے جاتے ہیں، اور ایک ناواقف بھولی بھالی لڑکی کو اِن سے کس طرح نجات مِل سکتی ہے

جب وہ افسانہ پر نظرثانی کر چکی تو اسنے آواز دی: سلیمن!

لڑکی دوڑتی ہوئی سامنے آئی اور بولی: جی بیگم صاحب!

نعیمہ نے کہا: - جاؤ اختر صاحب ہوں تو بلا لاؤ،

عارف چونک پڑے، جیسے کسی نے انکے تیر مارا ہو۔ ذرا تلخ لہجہ میں پوچھا؟ کون۔

اختر صاحب؟ وکیل صاحب کے لڑکے،

"ہاں"

"وہ سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔

"ہاں ہاں جی ... وہی،

"انہیں کیوں بلا رہی ہو، اُن سے تمھیں کیا کام ہے"؟

"اور تم کیوں پوچھ رہے ہو - تمہارے پوچھنے کا مطلب کیا ہے"؟

عارف کا مطلب کیا تھا، وہ بیچارے مطلب کیا بتاتے، مگر انہیں بڑا غصّہ تھا، غصہ کے ساتھ بیوی کی برہمی کا خوف بھی تھا، اسوقت انکی عجیب حالت تھی کچھ کہنا چاہتے تھے پھر زبان روک کر رہ جاتے تھے، آخر کار انہوں نے بڑی جرات کر کے کہا: دیکھو جی عورت کو اپنی حد سے باہر نہیں ہونا چاہئے، میں تم سے کہتا ہوں کہ کوئی صاحب میرے گھر میں نہیں آسکتے،

نعیمہ کتنی تدبیروں سے عارف کو اپنے بس میں کیا تھا کیسی کوششوں سے گھر پر اسکی حکومت قایم ہوئی تھی، یہ بنا بنایا کھیل یکایک بگڑا جا رہا تھا، مدت کی محنت اکارت جا رہی تھی اسکی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، وہ اس طرز عمل کی عادی کب تھی، اس نے یہ لہجہ کہاں سُنا تھا - اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، جھک کر بولی کیا کہا، نہیں آسکتے، کیوں نہیں آسکتے؟ کیا وہ کوئی بدمعاش ہیں، یا میں کوئی کسبی ہوں آئینگے اور ضرور آئیں گے، پہلے چاہے نہ بلاتی، مگر اب بلاؤنگی، دیکھیں تو تم ان کا کیا بگاڑ ے

تجربہ کی بنا پر نعیمہ کو یقین تھا کہ اب عارف کی زبان کو کچھ بولنے کی جرأت نہیں ہو سکتی، ایسا ہی ہوا۔ عارف کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ درحقیقت وہ بیچارے اُس کا بگاڑ ہی کیا سکتے تھے، خاموش ہو گئے نعیمہ کو کتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے شان فتحمندی کے ساتھ گردن کو دوسری طرف موڑا، سلیمن ابھی اسی جگہ کھڑی تھی، نعیمہ نے ڈانٹ کر کہا تو ابھی تک گئی نہیں، بڑوں کی بچی، چلی جا، اُنھیں بلا، آج ہمیں ان کی نوابی دیکھنا ہے سلیمن گئی، اختر صاحب آئے، بیٹھے چلے بھی گئے، مگر عارف نے دم نہ مارا سر جھکائے لکھتے رہے، البتہ غصہ کے جوش میں کاپی کا ایک صفحہ پھٹ گیا دو قلم ٹوٹ گئے، دوپہر کا کھانا نہیں کھایا، اور شام تک چادر سے سر منہ لپیٹے رہے۔

(۸)

اختر ذات کے شریف تھے، عادتوں کے شریف نہ تھے، بچپن سے صحبت خراب پائی تھی تربیت بھی کچھ اچھی نہیں ہوئی تھی، تعلیم کی کوشش تو بہت کی گئی مگر یونہی سا پڑھ کر چھوڑ دیا۔ باپ تھے وکیل، آمدنی تھی اچھی، ٹھاٹ سے رہتے تھے، اور شاعری کرتے تھے کبھی کبھی افسانے بھی لکھ لیتے تھے، طبیعت تھی شاعرانہ، دل تھا حسن پرست اور نفس کے لئے کوئی لگام نہ تھی، بدنگاہی کا بُرا چسکا پڑ گیا، راستہ چلتے کوٹھوں پر نگاہیں اٹھی رہتیں، دروازوں سے آنکھ لگی رہتی، کوئی چہرہ مہرہ کی اچھی ناک سک درست نظر آ گئی بس اب گھنٹوں اسی گلی کے صدقے ہو رہے ہیں۔ ایک روز یہ اپنے کمرہ میں شاعری کی دھن میں بیٹھے ہوئے قافیہ پیمائی کر رہے تھے کسی بلند مضمون کی تلاش تھی، سامنے تھا عارف کا مکان۔ نعیمہ دروازہ پر آئی، کسی کام سے جھانکی اُن کی نگاہ لڑ گئی۔ اف مار ڈالا ظالم کیا حسن پایا ہے، مجسم شاعری مکمل شعر، پردہ سے باہر اس کا خوبصورت چہرہ جیسے بادل کے ٹکڑے سے چاند نکل آیا ہو۔

یہ بدنگاہی کے عادی مجرم، وہ حیا کی زندہ تصویر، دونوں نے ایک دوسرے کو خوب دیکھا اختر نے اشاروں ہی اشاروں میں بتایا تمہاری قاتل نگاہوں کا تیر میرے دل میں پیوست ہو کے رہ گیا ہے، یہاں اس سے انکار کب تھا، نعیمہ نے بھی ایک خاص ادا سے مسکرا کر جرم کا اقبال کر لیا، نگاہوں کا یہ تعارف بڑھتا گیا، اور تکلف کو کم کرتا گیا، یہاں تک کہ نعیمہ کے افسانے پر اختر صاحب کی اصلاح ہونے لگی حسن و عشق کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیا۔ اس طرح گناہ کے لئے راستہ کھل چکا تھا، تھوڑی سی رکاوٹ رہ گئی تھی، وہ اب پوری ہو گئی اختر صاحب گھر میں بھی بلائے گئے، اور عارف کی موجودگی میں نئی دلہن کے چند صفحوں پر اصلاح دے گئے۔

ایک دن عارف گھر میں نہیں تھے، نعیمہ اختر کو نئی دلہن کا آخری حصہ سنا رہی تھی، سنتے سنتے یکایک اختر صاحب اچھل پڑے واہ واہ کیا خوب لکھ رہی ہو، عبارت نہیں جادو ہے، الفاظ تیر کی طرح دل میں اترے جاتے ہیں، موتی پرو دئے ہیں واللہ موتی، جی چاہتا ہے، انگلیاں چوم لوں،

نعیمہ چونک پڑی، انگلیاں چوم لیں! اس میں اس کے لئے کتنی کشش تھی، کسے معلوم تھا کہ پردہ ہی پردہ میں یہ دونوں کہاں پہونچ چکے ہیں۔ عورت کا حصہ شرم ہے، یہ اٹھ جائے تو اس کی عصمت کا خدا ہی حافظ ہے۔

نعیمہ بولی :- یہ انگلیاں اس قابل نہیں،

اختر کا دل دھڑک اُٹھا، بجلی کی تیز رَو کی مانند امید پیدا ہو کر ان کے سینہ میں جگمگا اٹھی کہنے لگے یہ انگلیاں کیسی ہیں، آہ اسے میرے دل سے پوچھو جسے تم نے دیوانہ بنا رکھا ہے،....... بس زیادہ نہ تڑپاؤ" للہ رحم کرو۔ صبر کی اب تاب نہیں،

تاب کی ضرورت بھی نہ تھی، اختر نے پردہ کے اندر ہاتھ ڈالا یا اور نعیمہ کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر اس کی انگلیاں چوم لیں۔

ہیں ہیں یہ کیا، چھوڑئے، مجھے یہ بات پسند نہیں،

نعیمہ کہنے کو تو یہ کہہ رہی تھی، مگر اس کے دل کی کیا کیفیت تھی اُسے کیسی لذت حاصل ہو رہی تھی، یہ عارف کا بوسہ نہیں تھا، ایک زن مرید شوہر ایک فرمانبردار مرد کے پیار میں عورت کے لئے لذت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

نعیمہ کی اس نہیں میں ہاں سے زیادہ طاقت تھی۔ اختر نے کہا "آپ کو نہیں پسند ہے، مجھے تو پسند ہے" اور پھر اسی گناہ کا اعادہ کیا نعیمہ نے آہستگی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا :- پھر وہی، بس اب ہاتھ تو چھوڑ دیجئے، خدا کے لئے یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا" کیا ہوگا، اس پر غور کرنے کے لئے، ہوش کسے تھا، متوالے شرابی کو ایک اور بوتل پلا کر ہوش کی دوا پوچھی جا رہی تھی، سمندر میں ڈوبنے والے سے ڈوبنے کا انجام معلوم کیا جا رہا تھا، کیسا انجام، ماضی و مستقبل کا خیال ہو تو انجام سوچا جائے، یہاں تو سامنے صرف حال تھا اور حال بھی اختیار سے باہر، اختر پر ایک کیف بے خودی طاری تھا" جو کچھ ہو میری جان، اب انجام کی فکر کسے ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے اضطراب کے ساتھ نعیمہ کو اپنی جانب پردہ سے باہر کھینچ لیا۔

" ہیں ہیں آپ کو میرے سر کی قسم، چھوڑئے، اے ہے، نہیں مانتے، یہ کیا غضب کر رہے ہیں، آپ دیکھئے تو سہی، سلیمن آتی ہوگی" یہ کہتی ہوئی نعیمہ اختر کی آغوش میں آ رہی۔

(۹)

"میں نے کتنی بار کہا ہوگا کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو، مگر نہیں باز آتے نہیں تو جیسے کوئی بیماری ہو، کہاں گئی تھی، جہنم میں گئی تھی" ایک تعلیم یافتہ بیوی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا مرد کو حق ہی کیا ہے؟ "کہاں گئیں تھی اس توہین آمیز سوال پر نعیمہ کو کیسا طیش آگیا۔ بیوی کے کڑے تیور دیکھکر عارف گھبرا گئے، ڈیڑھ گھنٹہ کی مردانہ کدو کاوش سے تنبیہ کے لئے جتنے الفاظ تراشے تھے سب فراموش ہو گئے، دل میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی، اس پر پانی پڑ گیا۔ انھوں نے آنکھیں نیچی کرلیں، پھر بھی آخر مرد تھے۔ بہت جی کڑا کر کے بولے :- میں بات پوچھتا ہوں، تم کاٹنے دوڑتی ہو، لاحول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی انسانیت ہے"

نعیمہ نے جھلا کر کہا :- لاحول بھیجو اپنی صورت پر بڑی انسانیت لیکر آئے ہیں، کیا اس کو کہتے ہیں انسانیت کہ ابھی ڈولی سے اتر کر گھر میں اچھی طرح قدم بھی نہ رکھنے پائی تھی۔ موئے کہاروں کو کہاری بھی تو نہیں دی گئی اور مواخذہ ہونے لگا صاحب کہاں گئیں تھیں، جہاں جی چاہا تھا، وہاں گئے تھے چلئے آپ ہمارا کیا کریں گے، تم آپ تو جہاں دل چاہے، جاؤ، دن دن بھر غائب رہو دوستوں کے ساتھ سیر

بازار کر و ادر میں جو ذرا دیر کے لئے کہیں جی بہلانے چلی جاتی ہوں، بس تمہیں زہر ہو جاتا ہے"

نعیمہ کا مزاج برہم ہو گیا تھا، یہ کوئی ادنیٰ بات نہیں تھی، عارف کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اب کیسی مصیبت کے ساتھ دن کٹیگا کس طرح اس قیامت صغریٰ کو ٹالا جا سکتا ہے، وہ نرم لہجہ میں کہنے لگے :- اس میں زہر کی کونسی بات تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، جانے کو کون مرد دو منع کرتا ہے، مگر آدمی کھانے پینے کی تو فکر رکھتا ہے، یہ وقت ہونے کو آیا، تمہیں بتاؤ اب کب کھانا تیار ہوگا اور کب کھایا جائیگا۔

نعیمہ نے تنک کر جواب دیا :- صاحب ! بندی کوئی ماما تو ہے نہیں جو ٹھیک وقت پر سرکار کے سامنے دستر خوان لگا دے، دیر ہو رہی ہے تو میری بلا سے، انتظار کی ضرورت ہی کیا تھی، بازار سے کچھ لا کر کھا لیا ہوتا، اور اس وقت تو یوں بھی لانا پڑیگا، مارے درد کے میرا بھیجا ٹپکا پڑتا ہے۔

ایک دن کی بات ہو تو صبر کیا جائے، نعیمہ کا روز یہی رنگ تھا، عارف کی جان سخت عذاب میں تھی کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی، اور بڑی ہمت کر کے کہتے تو ایک کے بجائے چار سنتے اور اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے، پچھتاتے تھے کہ شادی کر کے کس بلا میں گرفتار ہو گیا۔ تنہائی میں بیٹھتے تو پہروں سوچا کرتے، اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی تدبیر بھی ہے۔ طلاق دیدوں تو مہر کے دس ہزار سرخ دینار کہاں سے آئیں گے، کہیں منہ کالا کر جاؤں؟ غیرت کا یہ تقاضہ نہیں، زہر کھاؤں؟ خودکشی حرام ہے۔

ادہر انکی یہ حالت تھی، ادہر محبت کے پینگ بڑھ رہے تھے، اختر دوسرے تیسرے برابر آتے، دروازہ پر آواز دیتے، منشی جی!! نعیمہ بول اُٹھتی، آئیے، یہ آجاتے، عارف گھر میں نہ ہوتے تو اظہار محبت کے لئے میدان بالکل صاف ہوتا اور موجود ہوتے تو کبھی "اُنے ہے خدا کی مار اس گھر پر، جب کوئی آتا ہے تبھی پان ندارد، جیسے کوئی آن ہو" اور کبھی "اس گرمی سے خدا کی پناہ آگ برس رہی ہے آگ، گھڑوں میں پانی جیسے ادھن ہو"

"منشی جی! ذرا چوراہہ سے دو پیسے کا برف تو لے لو، مارے پیاس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں" کہکر میدان صاف کر لیا جاتا، اختر و نعیمہ کو کیسی آزادی حاصل تھی، لیکن ان کے دلوں اندرونی تڑپ کے لئے یہ آزادی بھی کیا تھی، وہ تو نفس کے کھیل کھیلنے کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہنا چاہتے تھے،

گھر خالی ہے، دولت کا ڈھیر سامنے ہے، پہرہ دار کا پتہ نہیں، دنیا اپنے کاموں میں مشغول ہے، پھر بھی چوروں کو دھڑکا لگا ہوا ہے ہوا کی سنسناہٹ، راہگیروں کی آواز پر اختر و نعیمہ باتیں کرتے کرتے چونک اٹھتے،

یہ خوف ان کی محبت کے ولولوں اور جوانی کی امنگوں میں کتنا حارج ہوتا تھا، انھیں اس خوف پر کیسا غصہ آتا تھا کوئی جاندار چیز ہوتی، تو زہر دیکر اس کا خاتمہ کر دیتے،

پھر بھی وہ کہاں تک اس روح فرسا اذیت کا مقابلہ کرتے رہتے، خوف اور رسوائی پر محبت کی لذتوں کو کب تک قربان کیا جا سکتا تھا آخر کار انھوں نے طے کر لیا کہ "رہئے بس ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو" یہ تجویز ہی تجویز نہ تھی، ایک تہیہ تھا مستقل، ایک ارادہ تھا مضبوط،

ایک روز موقع پاکر نعیمہ زیور کا صندوقچہ اور کپڑوں کا بکس لیکر اختر کے ساتھ چلدی،

بیوی کے حاکمانہ اقتدار نے عارف کی مردانہ حمیت کو کم کردیا تھا پھر بھی یہ حادثہ کم شرمناک تھا، یکایک ان کی دبی ہوئی غیرت ابھر آئی، وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، ان کی بیوی ایک غیر مرد کے ساتھ بھاگ گئی، کیسی شرم و ذلت کی بات تھی اس شرم و ذلت کے سامنے رسی کا پھندا، چھری کی دھار، زہر کا پیالہ کیا حقیقت رکھتا ہے،

ان سب چیزوں کے مقابلہ میں عارف نے دریا کی موج کا سہارا لینا زیادہ مناسب سمجھا، مرنے کے بعد بھی دنیا کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتے تھے،

ہوا بھی یہی، کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی کہ اس دنیا کے ہنگامہ میں جہاں بیشمار میاں بیوی لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک زن مرید شوہر نے گنگا کی لہروں کے تھپیڑے کھا کھا کر دم توڑ دیا۔

اختر و نعیمہ نے جو گناہ کی عمارت کھڑی کی تھی، اس کی بنیادیں پانی پر تھیں، نفس کے دریا میں زندگی کی ناؤ پار نہیں لگائی جاسکتی ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اختر کے لئے نعیمہ میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی، اس کی اداؤں کا ترکش خالی ہوگیا، لذت ہی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا، زیور بھی ختم ہوگیا تھا۔

ایک دوست کے ساتھ گرمی کا ایک مہینہ کشمیر میں بسر کرنے کا وعدہ بھی، جو انھوں نے اپنے باپ سے کیا تھا، پورا ہو لیا، ان کی شادی کے دن بھی قریب آگئے تھے بھونرے کی طرح، جو ایک کلی کا رس چوسنے کے بعد دوسری کو آزار پہونچانے کا ارادہ کرتا ہے، انہیں نئی نویلی دلہن کا خیال بےچین کئے ہوئے تھا، وہ کس طرح اب نعیمہ کے ساتھ رہ سکتے تھے، بالآخر ایک دن ایسے غائب ہوئے کہ بدنصیب عورت کو پھر ان کی صورت تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی، پردیس کی جگہ، بالکل تنہائی، کسی سے جان نہ پہچان، ہاتھ میں پیسہ نہ کوڑی زیور پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

لیکن ان مصیبتوں سے نجات پانا نعیمہ ایسی عورت کے لئے کیا مشکل تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ معصیت کی تکرار ہی نتیجہ معصیت کا علاج ہے۔

عابد لہوری

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافے

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ، قمیص، شیروانی اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگا کر استعمال میں لائیے :- ملنے کا پتہ

مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی

فلسفۂ مذہب

(گزشتہ سے پیوستہ)

مذہب اور قومیت

دنیا میں عموماً دو قسم کے مذہب پائے جاتے ہیں ایک قومی اور دوسرے عمومی۔ قومی مذاہب ہنود، یہود ومجوس ہیں عمومی مذاہب بودھ، نصرانیت اور ایک حد تک اسلام ہیں۔ پہلے قسم کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک قوم کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور دوسری قوم میں اس کی اشاعت ممنوع و ناممکن ہوتی ہے اس کے برخلاف دوسرے قسم کے مذہب ہیں مگر اسلام کی صورت دونوں کے بین بین عجیب ہے۔ وہ اس لحاظ سے قومی مذہب ہے کہ قرآن کے ساتھ مذہب کا جزو وہ قومی شریعت بھی ہے جو بالخصوص عرب کے لئے قرآن اور زیادہ تر روایات سے تدوین کی گئی ہے کیونکہ جب کسی مذہب کے ساتھ شریعت جزو لازم ہو تو وہ قومی مذہب پایا جائیگا اور اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ قانون ایک خاص معاشرت کے قوم کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ عمومی مذہب شریعت کا پابند نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اس مذہب میں ہر قوم کو شریعت میں اختیار کا حق حاصل ہو۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسلام ایک عربی شریعت کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ اسلام کے پیرو مختلف جنس و قبائل کے لوگ ہیں اور اس کی اشاعت دوسری قوموں میں ممنوع نہیں۔ اور اسلام کے منجملہ تمام دوسرے حسنات و مآثرات کے جو اقوام عالم پر بیان کئے جاتے ہیں سب سے دلچسپ بحث اس کے اس اثر کی ہے جو اس نے مختلف قوموں کو ایک رنگ اور ایک خیال میں ڈھالکر اس کو ایک مرکز و ایک شریعت سے وابستہ کر دیا ہے ہمارے لئے تو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو ہم اسلام کے احسانات میں شمار کرتے رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے اس ایک ”فعل“ نے مسلمانان عالم کی ایک عجیب صورت بنا کر انکو قومی، دنیاوی ترقی سے خالی کر دیا ہے بلکہ اسلام کی تبلیغی ترقی میں اس درجہ حائل ہے کہ بلاشبہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم صاف لفظوں میں اس کی خرابیوں کا اعادہ کریں اگرچہ وہ اکثر اصحاب فہم کے لئے ایک چونکا دینے والا نظریہ ہوگا۔

سب سے پہلے ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کہ اسلامی اخوت دنیا کے لئے باعث امن ہے، ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ اسلام نے خود اپنی جداگانہ قومیت دنیا میں بنالی ہے جس کے صرف یہ معنی ہیں کہ قوموں کے شمار میں ایک عجیب معجون مرکب قوم کا اضافہ ہو گیا ہے جس کا تعلق دوسری غیر مسلم قوموں سے بالکل اسی طرح ہے جس طرح دوسری مخالف اور مختلف قوموں میں اس لئے جب تک وہ خیر القرون جس کی امید صرف ظہور امام مہدی کے وقت کیجا سکتی ہے یعنی جبکہ دنیا میں صرف ایک مذہب اسلام پھیل جائیگا اور تمام مذاہب مفقود یا اسلام میں جذب ہو جائینگے ہم سے دور ہے۔ اس وقت اسلام کے وجود سے دنیا کے امن میں کسی اضافہ کی امید رکھنا عبث ہے۔ اسلام نے جو کچھ اب تک کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے خود اپنی ایک جداگانہ قومیت بنائی ہے جس کے اندر راہ کتنی ہی اخوت کیوں نہ پائی جائے غیر مذاہب (خواہ ان کے افراد اسلام کی بوقلموں قومیت کے اندر ایک ممتاز ہستی کیوں نہ رکھتے ہوں) کے ساتھ اس کے تعلقات میں وہ ساری خرابیاں

موجود ہیں جو دو قوموں میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ بس بالفعل اسلام نے بجائے اس کے کہ قومیت کی لعنت کو کم کرے ایک اور قوم کا اضافہ کرکے اُن کو بڑھا دیا ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ افتراق جو ایک قوم میں پہلے سے نہ تھا اور نہ ہونا چاہئے اس قوم میں اسلام پھیلنے پر پیدا ہوگیا یعنی وہ ایک قوم جلد دو قوم میں تقسیم ہوجاتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ وہی معاشرت رکھتے ہیں جو دو متضاد قوموں میں ہوتی ہے مثال کے لئے ہندوستان کے اندر اس تفرقے کو دیکھ لیجئے۔ راجپوت و جاٹ شمالی ہندوستان کی دو ممتاز قومیں ہیں جو اپنی قومیت پر جتنا مفتخر ہوں بجا ہے۔ اسلام نے راجپوت و جاٹ کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں، مسلمان راجپوت و ہندو راجپوت جن میں سے ایک کا مرکز ہندوستان رہا اور دوسرے کا عرب و عجم ہوگیا۔ کیا مسلمان راجپوت اور ہندو راجپوت میں ویسی ہی قومیت نہیں ہے جیسی انگریزوں، فرانسیسوں یا جرمنوں میں ہے مسلمان راجپوت بجائے اس کے کہ اپنی قومیت پر فخر کرتا وہ اپنے کو ——— ——— ایک نئی مسلمان قوم میں شمار کرنے لگتا ہے وہ بالکل اپنی قوم سے بیگانہ ہوکر اپنے نسب۔ اپنے وطن، اپنے لباس اپنی قومی روایات و مراسم سب کو (معلوم نہیں کیوں) عرب و عجم سے ملانے کا شائق پایا جاتا ہے شاید یہ خاصہ ہندوستان کی ذہنیت کا ہے کہ قوم ہند ایک مدت سے ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہے اسیطرح اگر ہم دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر نظر ڈالیں تو غالباً البانیہ کے مسلمانوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے باوجود اپنی قومیت و خصوصیت کیساتھ مسلمان ہیں یہ کلیہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ روس و پولینڈ میں جب کبھی روس یا پولش مسلمان ہوجاتا ہے تو اس کا شمار تاتاری جماعت میں ہونے لگتا ہے اس کا سر منڈ جاتا ہے اور کلاہ تاتاری زیب سر ہوجاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں عیسائی جب تک عیسائی رہتا ہے وہ اپنی پُرانی تاریخی قومیت ارمنی۔ کلدانی۔ سریانی قبطی کے نام سے مفتخر رہتا ہے مگر جہاں اس نے اسلام کا کلمہ پڑھا وہ ترک یا عرب بن جاتا ہے حتیٰ کہ افریقہ کے وحشی سماترہ و جاوا کے ملائی اور چین و منغولیا کے مغل بھی اسلام کے بعد اپنے ابنائے وطن سے جداگانہ ایک قومیت کی بنیاد ڈال لیتے ہیں سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی ساری قومی خصوصیت کو بدل کر عرب و عجم کی خصوصیت اختیار کرلیں یا تو وہ غلطی سے اسلام کو عرب کا مرادف سمجھتے ہیں جس طرح زمانہ وسطےٰ کے اہل یورپ تمام مسلمانوں کو مور یا سراسن کی قوم جانتے تھے اور ایسا کرنا شرط اسلام جانتے ہیں یا اسلام لاکر ان کو اپنی قوم سے ایسی نفرت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی کوئی بات اختیار کرنا اپنے لئے باعث عار جانتے ہیں یہ ہی آخری صورت ہے جس کی ذمہ داری اگر اسلام کو دیجائے تو اسلام کے متعلق یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے دنیا میں بجائے نیکی کے ایک لامی برائی کا بیج بویا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس عالمگیر مذہب کو جو قرآن بناتا ہے ان خرافات سے کوئی تعلق نہیں البتہ اگر اسلام کے لئے بجائے قرآن کے فقہ و حدیث کی سند ہو تو ہم کو اسلام کی بالکل ایک نئی صورت ملتی ہے جو مسلمانوں کے لئے عربوں کی خصائل و عادات کا اظہار کرنا ہمارے لئے شرط اسلام جانتا ہے یا دوسرے معنے میں مذہب کو قومیت اور اعتقاد کا ایک طرفہ معجون بنا دیتا ہے اور اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو قدیم مذہب یہود سے ترجیح دیکر اختیار کریں

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی اصل صورت کیا ہے۔ اگر اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جیسا کہ ہم سب بجا طور سے خیال کرتے ہیں اور اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے تو کیوں ہم عربی قومی خصائص کے لئے مثلاً ختنہ، عقیقہ، طواف کعبہ، سعی صفا و مروہ

امتناع لحم خنزیر، احکام وراثت نکاح و طلاق و ازدواج بیع و شرا) بلکہ ایک خاص طریقہ عبادات کے لئے (جو بالتحقیق عربی زبان میں تھا) مجبور کئے جاتے ہیں اور بغیر اُن کے ہم مسلمان نہیں سمجھے جاتے ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کا بلحاظ آب و ہوا، مزاج، زبان، عادات معاشرت و تمدن وغیرہ اختلاف رکھنا ایک فطری خاصہ ہے۔ کوئی شخص انگلستان کے مروجہ قانون کو بلا لحاظ ہندوستان کے طبائع کے رائج کرنے کا خیال نہ کریگا بلکہ وہ اس کے مطابق ایک نیا قانون بنائے گا جیسا کہ ہم واقعتاً دیکھتے ہیں۔ پس اگر اسلام عربی قوم کے لئے مخصوص تھا تو اس کا دوسری قوم میں پھیلانا بے معنی ہے۔ اور اگر پھیلایا جائے تو اس کی اول شرط یہ نہ ہونی چاہئے کہ ایسی قوم کو پہلے عربیت میں ڈھالنا چاہئے اور اس کے بعد اُن کو مسلمان کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے پر کبھی غور نہیں ہوا اور عربوں نے اپنی فتوحات کے ساتھ اپنی تمام قومی خصوصیات کو اسلام کے ساتھ ایسا گڈمڈ کرکے پیش کیا ہے کہ ہم اب تک دونوں کو ایک سمجھتے رہے اور اسیکو مدنظر رکھ کر، فقہ و قیاس سے کام لیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قومیں فطرتاً عرب کے عادات اختیار کرنے کے قابل نہ تھیں خصوصاً جو سرد ملکوں مثلاً یورپ کی رہنے والی تھیں ان کو اسلام لانے میں ہمیشہ تکلف ہوا اور اسلام صرف اُن ممالک میں پھیل کر رہگیا جہاں تک عربوں کی تلوار و سلطنت وسیع ہوئی ——————

یا ان گرم ممالک میں جہاں ان کو سیاحت و تجارت، یکگی اور آب ہوا کے لحاظ سے اور زیادہ تر عربوں کے مقابلہ ادنےٰ تمدن کے سبب سے وہ عربوں کی عادات و خصوصیات اختیار کرنے کے لئے زیادہ مستعد پائے گئے۔ اور اسلام ایک حد کے اندر پھیل کر ٹھٹر گیا۔ پس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عربوں نے خود غرضی سے اسلام کو اپنا مرکب بنایا اور خود راکب بنے۔ درانحالیکہ ان کو یہ امانت اس لئے ودیعت کی گئی تھی کہ وہ مرکب بنیں اور اسلام راکب ہو ——— چنانچہ اہل شام و مصر و بربر کو مجبوراً اپنا تمدن بدلکر مستعرب قوم بننا پڑا۔ اور اہل عجم نے ——— اپنا قومی شعار و زبان عربوں کے لئے نہ بدلی انھوں نے شریعت کے قیود سے باہر ہو کر صوفیت کی بنا ڈالی۔ اسلام کو اس خطرناک غلطی کا اسوقت تک پتہ نہ چلا جب تک عرب پر حکومت کا خمار تھا مگر جب یہ خمار ٹوٹا تو اس کیساتھ اسلام کا رشتہ ترقی بھی تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ اگرچہ اسلام متعدد قوموں میں پھیلا ہوا ہے اور وہ سب ملکر ایک قوم "اسلام" کے ماتحت ہیں مگر سب حالت اختلاط میں پڑے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھوں نے اسلام کا ایک قومی لباس مقرر کر چھوڑا ہے ——————

——— خود ہمارے ملک کو دیکھو مسلمانان ہند کو اپنی قوم ہند کی ترقی سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ بحیثیت مجموعی ایک جداگانہ قوم ہیں، جن کی زبان جُدا، معاشرت جدا، تمدن جدا، روایات جدا، وہ اپنے ملکی لٹریچر سے نابلد۔ ہندوستان کی ہی ترقی سے متنفر اپنے ملکی اباو اجداد کی اولاد ہونے سے عار۔ اپنے سرزمین کے آثار عظیم سے بے خبر و معرا۔ ان کو اگر ہے دیکر کچھ یاد ہے تو ہارون رشید و تیمور کی داستان یاد ہے۔ اگر اُن کو کسی کے انتساب سے فخر ہے تو وہ عرب و عجم ہے۔

بس مذہب اور قومیت کی بحث میں ہم اسلام کی یہ مثال دیکر سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم مذہب کے لئے کس قدر مکلف ہو سکتے ہیں۔

دنیا کا مذہب جیسا ہم پہلے لکھ آئے ہیں خود رو رہا جبکہ اس کی خاص خصوصیتیں حجر و اشجار - ارواح خبیثہ - سانپ و عناصر عالم کی بندگی و قربانی ، ساحریت و کہانت تھیں بذریعہ ارتقا یا بذریعہ علم لدنی انسان کو توحید و معاد کی طرف توجہ کرنی پڑی ——

یہاں تک تو مذہب ہے ۔ مگر اکثر انبیا جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو ایک طرف وہ حامل اسلام تھے اور دوسری طرف وہ خود اپنی قوم کے مقنن و مصلح تھے - ایک حیثیت انکی روحانی ہوتی —— اور ایک مادی اور دنیاوی تاریخ نے ہمارے دو پیغمبروں کے نام پیش کئے ہیں - جو مقنن و صاحب شریعت و امر کے ساتھ معلم دینی بھی تھے یعنی جناب موسیٰ علیہ السلام و جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ممکن ہے کہ جناب بودہ و زردشت و مسیح کو بھی یہی درجہ عطا ہوا ہو مگر اول دو کے بارے میں مجہول ہے اور تیسرے کے بارے میں منکر ہے - جناب موسیٰ علیہ السلام نے مذہب کے ساتھ اپنی قوم کو متمدن بنانے کے لئے بہت سے مشاغل دنیاوی بھی الہامی ذریعے سے بتائے اور چونکہ ان کے زمانے کی ہر قوم میں پیغمبر مبعوث ہوا کرتے تھے اس واسطے نہ تو اُن کا مذہب قانون و شریعت سے علیحدہ کیا گیا اور نہ ان کے بتائے ہوئے مذہب کی اشاعت سوائے بنی اسرائیل کے دوسری قوم میں کی گئی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی - بدہ اور مسیح کو دنیاوی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا وہ خود کسی شریعت کے موجد نہ تھے بلکہ غالباً ایک ——— ہندو شریعت اور دوسرا یقیناً یہودی شریعت کا پابند رہا - گویا یہ دونوں اصحاب ہندو و یہود مذہب سے وہی تعلق رکھتے تھے جو ہمارے صوفیائے کبار کا تھا - مگر ہمارے پیغمبر کیساتھ جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک طرف حامل اسلام تھے تو دوسری طرف وہ عرب قوم کے صاحب شریعت و امر بھی تھے - لیکن جس مذہب اسلام کے وہ حامل تھے اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ تمام عالم کے لئے ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہیگا - یعنی ایک طرف وہ تمام عالم کے لئے مبعوث نبی تھے اور دوسری طرف ایک قوم کے دنیاوی سردار تھے - ہم جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے دونوں کاموں میں روح القدس کی مدد بلا شبہ اُن کو ہوئی اور جو قرآن ان کو دیا گیا ہے اس کا ایک حصہ اگر مذہب اسلام کے عالمگیر معرفت اعتقاد سے مخصوص تھا تو دوسرا حصہ ملت عرب کے احیاء دنیاوی کے لئے مگر ہم نے کبھی اسپر غور نہ کیا کہ ایک کا مخاطب تمام عالم ہے اور دوسرے کا صرف اس زمانے کے عرب - یعنی اس کا ایک حصہ ازلی و انتہائی پہلو لئے ہوئے تھا جس میں عبادت حق - خدمت حق تزکیہ نفس اعتقاد توحید و معاد پر مشتمل تھا اور دوسرا حصہ زمانی و مکانی یعنی وقتی و عرب کے لئے مخصوص تھا جس میں طہارت جسم و لباس معاشرت کے بعض اصول مثلاً اذن بگر دوسرے کے گھر داں یا خلوت میں جانا عورتوں کو بے حیائی کے ساتھ مردوں کے سامنے آنے کی ممانعت ——— وراثت ازدواج و طلاق - یا تعزیرات مثلاً قطع ید سارق . وغیرہ کو ——— بنظر اس کے کہ عربوں سے بہت جلد تبلیغ اسلام کا کام لینا تھا اور اس کے لئے دنیا کے ایک بڑے خطے پر حکمران کرنا تھا محض بطور احسان مزید کے بتا دیا ورنہ الہام درحقیقت ان معاملات کے تعلیم کیلئے مکلف نہیں کیونکہ فطرت انسانی نے خود دنیاوی ترقی کے مدارج پر پہونچنے کے لئے کافی عقل و تمیز انسان کو عطا کی ہے - عربوں نے اصول معاشرت و سیاست اور وہ اصول سیکھ لئے جو انکی ہمسایہ قومیں عرب کے ترقی کے بعد سیکھ رہی تھیں اور ابھی تک اس میں کامل نہیں ہوئی تھیں - اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ واقعی وہ پچاس برس کی مدت میں تمدن قوموں کی زمرے میں کھڑے ہوگئے - دنیا کے فاتح ہوئے اور اپنے ساتھ اسلام کی

چنگاری

(مسلسل)

(۸)

یوسف، دارجلنگ ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں، جہاں ہر چیز اپنی نفاست و پاکیزگی کے لحاظ سے پری معلوم ہوتی تھی بیٹھا ہوا تھا اور یہ دیکھکر کہ یہاں جو بھی ہے انتہائی نشاط کے عالم میں "جوہر مصفی" سے لبریز شفاف گلاسوں سے مشغول نظر آتا ہے، دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سب کے سب احمق ہیں؟ کیا سارا مغرب، جو اپنے دماغی نشو ونما کے لحاظ سے آج بجا طور پر مشرق کو صدائے لن ترانی سنا سکتا ہے، بیوقوف ہے؟ اگر یہ حماقت اس قدر زیرک انسان پیدا کر سکتی ہے اگر یہ بیہوشی ایسے ذیہوش دماغوں کو محبوب ہے۔ تو مجھے یا کسی کو بھی عقلمند باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ——— اس تمام مجمع میں صرف یوسف ہی ایک ایسا شخص تھا جو تنہا پایا جاتا تھا، ورنہ ہر مرد کے پہلو میں کوئی نہ کوئی حوا کی بیٹی اس مختصر سی جنت میں ضرور شریک نشاط تھی۔ وہ اپنی تنہائی کا خیال کر کے کبھی ایسا محسوس کرتا کہ شاید اُسے سب لوگ حقیر و ذلیل خیال کر رہے ہیں اور اس خیال سے اس کے چہرہ پر پسینہ آجاتا ——— وہ سمجھنے لگا تھا کہ مرد کا تنہا وجود اس کے لئے ایک لعنت ہے اور مدعائے حیات بغیر اُس کے دوسرے نصف حصّہ کے ملے ہوئے پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ دوسرا گمشدہ "نصف حصّہ" کہاں ملے؟ اس خیال نے پھر مس ہلن کی تصویر اس کے سامنے پیش کر دی اور اپنی ناکامی اور اس کی بیوفائی (جسکو وہ ہنوز شرارت ہی سے تعبیر کرتا تھا) کے خیال سے پھر دلگرفتہ سا ہو گیا اور مس ہلن کے اس فقرہ پر غور کرنے لگا کہ "جس تیتری پر آپ قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اسپر دسترس حاصل کرنے کے لئے پہلے سر دینا ضروری ہے"۔

کیا سر دینے سے واقعی جان دینا مراد ہے نہیں یہ تو صرف شاعری ہے، پھر کیا اس سے یہ مقصود ہے کہ حواس کھو دوں، دیوانہ ہو جاؤں۔ نہیں یہ بھی لغو بات ہے، پاگل کو کون پوچھتا ہے۔ تو کیا یہ مدعا ہے کہ میں انتظار کی غیر معمولی تکلیف برداشت کروں، لیکن یہ کیوں؟ کیا میں یوں اُن کی عزت کرنے کے لئے طیار نہیں؟ ممکن ہے یہ صرف ان کی شوخی ہو، یا پھر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ میں کس حد تک اپنے شوق کی رعایت سے اُن کی جستجو کر سکتا ہوں ——— سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کا خادم آیا اور اس وثوق کی بنا پر کہ اس حمام میں کون ہے جو عریاں نہیں، اس کے سامنے بھی ایک شفاف گلاس شراب کا رکھ کر چلدیا۔ یوسف کو توجہ اُس وقت ہوئی جب وہ کمرہ کے دوسرے بعید گوشہ میں پہونچ چکا تھا، آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی اور چونکہ اب بعض اور لوگوں کی نگاہیں اسپر پڑ رہی تھیں اس لئے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا کہ واپس کر کے یا دور ہٹا کر اپنی وحشت کا ثبوت دے، یہ خاموش ہو گیا اور اپنے چہرہ پر ایک ایسی کیفیت پیدا کر لی، جس سے یہ ثابت نہ ہو کہ وہ اس تہذیب معاشرت سے ناواقف ہے اور اُس نے کبھی شراب نہیں پی۔ لوگوں کے دکھانے کے لئے گلاس کو اور قریب کر لیا اور سوچنے لگا کہ اب احتراز اس سے کیونکر ممکن ہے خادم کو بلا کر واپس کر نہیں سکتا کہ اس کا وقت

گزر چکا تھا، فرش پر پھینک نہیں سکتا تھا کہ اس کا کوئی موقع نہ تھا، چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا کہ یہ تہذیب کے خلاف تھا، وہ دیر تک چھوٹے چھوٹے سنہرے بلبلوں کو جو سوڈا کی تیزی کی وجہ سے پیدا ہو کر گلاس کی تہ سے شراب کی سطح تک آ آ کر مٹ رہے تھے دیکھا کیا اور غور کرتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ چونکہ اس سے قبل کبھی اس نے پی نہ تھی اور وہ ایک قسم کا خوف جو شراب نہ پینے والے کے دل میں پینے سے قبل جاگزیں رہتا ہے، اس کے دل میں بھی موجود تھا اور ناواقف لوگوں کی طرح شراب کو وہ بھی بدحواسی ہی کا مترادف سمجھتا تھا اس لئے ہمت کرتا تھا اور رہ جاتا تھا، گلاس کی طرف ہاتھ بڑھتا تھا اور رک جاتا تھا اُس نے نگاہ اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو سب کو اپنے حواس میں پایا، اچھی طرح انسانیت کیفیت باہم گفتگو کرتے دیکھا ــــ اسی وقت نیچے سڑک پر ایک شخص یہ شعر الاپتا ہوا گزرا ہے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس شعر نے فوراً اس کا خیال اپنی طرف متوجہ کیا اور ایک ہلکا سا تبسم اس کے چہرہ پر دوڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا، کیا واقعی شراب ایسی چیز ہے کہ شاعر اپنے آخریں لمحات حیات میں بھی اسی کی خواہش کرتا ہے۔ اب اس کے سامنے ایک ایک کرکے تمام اکابر شعراء کا خیال آنے لگا اور بہت سے وہ اشعار یاد آنے لگے جن پر اس نے پہلے کبھی غور بھی نہ کیا تھا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ حافظ کو کس چیز نے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

مے نوش کہ عمر جاودانی این ست

اور یہ کہ کیا واقعی حافظ کا یہ فلسفہ بالکل صحیح ہے کہ

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

اس کے بعد خیام کے خمریات نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا، اور اس کے اس پر زور اعتراف پر مسکرانے لگا:۔

من مے خوام دہر کہ چو من اہل بود

مے خوردن من بنزد او سہل بود

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا، بادل گھر آئے، ترشح ہونے لگا، بجلی چمکنے لگی، ہال کے تمام برقی قمقمے جگمگا اُٹھے، ہر چیز روشن و منور ہو گئی اور اس نے حافظ کی اس رباعی سے فتویٰ حاصل کرکے

آں بہ کہ زجام بادہ دل شاد کنیم   وز آزردہ گزشتہ کم یاد کنیم

ویں عاریتے روانِ زندانی ما   یک لحظہ ز بند عقل آزاد کنیم

آخرکار گلاس کو اٹھایا، ڈرتے جھجکتے اس کو لبوں تک پہونچا ہی دیا۔ تلخی اور بُو سے جو جھرجھری سی جسم پر پیدا ہوتی ہے، اُس کو ضبط کیا اور ہمت کرکے ایک ہی منٹ کے اندر اس نے دو دفعہ کرکے سارے گلاس کو ختم کر دیا تاکہ اس منزل سے جس قدر جلد ممکن ہو گزر جائے۔

سب سے پہلے جو اثر اُس نے محسوس کیا وہ کان کی گرمی تھی اور اس کے ساتھ ہلکی سی حرارت دماغ میں، وہ دل ہی دل میں ہنسا کہ

میں تو شراب پینا بڑی بات سمجھتا تھا، لیکن یہ تو بہت آسان نکلا، تھوڑی دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ ہوا کی برودت اور موسم کی خنکی کچھ زائل سی ہونے لگی ہے اور اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی ایک چنگاری سی پیدا ہو جاتی ہے اب اس کے بدن میں بھی سنسناہٹ پیدا ہونے لگی اور اس کا جی چاہنے لگا کہ جسم کو زرا ڈھیلا چھوڑ کر کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا دے۔ وہ ہلکی سی بے اختیاری کے ساتھ سیدھا ہو کر پیچھے جھکا اور کرسی سے پیٹھ لگا دی، اب وہ اپنی نگاہ میں، اپنے دماغ میں اپنے احساس میں ایک قسم کا استغنا محسوس کر رہا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ ہال کا وہی ہجوم جس پر وہ اس سے قبل کچھ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی نگاہ ڈالتا تھا، اس وقت بے معنی سی چیز نظر آتا تھا اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا میں اس کا وجود بھی کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی کیفیت بڑھتی جاتی تھی اور اس کی حرکت جنبش میں سرعت سی پیدا ہوتی جاتی ہے، اُس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا لیکن خاص تیزی کے ساتھ، دیا سلائی روشن کی مگر ایک جھٹکے کے ساتھ، دیا سلائی کو سامنے کی طشتری میں ڈالا لیکن اس طرح جیسے دور سے کسی چیز کو پھینک دیا جاتا ہے اور پھر کرسی سے پیٹھ لگانے کے لئے جھکا مگر زیادہ ڈھیلے پن کے ساتھ۔ اس کے حواس درست تھے، اس کا دماغ معطل نہ تھا، وہ پوری طرح اپنی حالت کا تجزیہ و تنقید کر سکتا تھا اور کیفیت کے ہر تغیر میں وہ امتیاز پیدا کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ حالت اب قائم سی ہو گئی ہے اور اُس نے اس خیال سے کچھ بے لطفی سی محسوس کی، کیونکہ ابھی تک اس نے اپنے اندر کوئی ایسی خاص بات نہ پائی تھی، جو جواز بادہ خواری کو ضروری قرار دیتی، اس لئے وہ سمجھا کہ اس کیفیت کو اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس نے خادم کو آواز دی اور ایک گلاس اور طلب کیا۔ وہ لایا اور یہ بلا تامل اسی کے سامنے نصف حصہ ختم کر گیا، اس نے دیکھا، ان کی اس بے قاعدگی پر اک متبسم نگاہ ڈالی اور پھر جب یوسف کی نظر اوپر اٹھی تو اُس نے نہایت ادب کے ساتھ سر جھکا کر کہا کہ "حضور بہت تھوڑی تھوڑی ایک ایک گھونٹ کر کے کم از کم آدھ گھنٹہ میں اس گلاس کو ختم کریں تو بہتر ہے"۔ یوسف نے سنا اور باوجود اس کے کہ شراب کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینے کے متعلق اس کو کتابی علم بھی حاصل تھا، اس نے کہا کہ "نہیں" اور جس طرح کوئی بچہ ضد کر بیٹھے، باقی نصف حصہ بھی ختم کر کے گلاس کو نازور سے میز پر رکھ کر حکم دیا کہ "اور لاؤ"۔ خادم سر جھکا کر واپس گیا اور پھر اپنی حالت و کیفیت کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ وہ جو نشہ میں ایک قیام کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس میں تغیر پیدا ہونے لگا اور زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں تک کہ چند منٹ کے اندر اب وہ اپنے آپ کو کسی اور ہی عالم میں پاتا تھا۔ قمقموں کی روشنی اسے تھرتھراتی ہوئی نظر آتی تھی، ہال کا فرنیچر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید مائل پرواز ہے، اور وہاں کے آدمی ایسے نظر آتے تھے جیسے کہیں بہت دور بیٹھے ہیں اور ان کی آوازیں بہت ہلکی ہو کر اس کے کانوں تک پہونچ رہی ہیں۔ اب اس کے اندر نشاط تھا اور نشاط کامل، نہ مس ہلن کا وجود اب اس کے سامنے کوئی اہمیت رکھتا تھا اور نہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کل اُسے کیا کرنا ہے۔ ایک بیخودی تھی غم ربا، ایک وارفتگی تھی روح افزا، ایک جسارت تھی لطف انگیز، ایک ولولہ تھا مسرت خیز۔ اس وقت ایک ایک چیز اس کو مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر دعوت قہقہہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور "چشم وا کردم

زمین تا آسماں آغوش داشت"

اب وہ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتا تھا کہ شاید کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور بار بار حافظ کے "ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم" کی اہمیت اس کے سامنے آجاتی تھی۔ جوشِ مسرت میں اس کا جی چاہتا تھا کہ زور سے باتیں کرے، بلند

آواز سے گائے، اٹھکر رقص کرے۔ تالیاں بجائے اور کسی نہ کسی طرح اس ہنگامہ کو دنیا کے سامنے پیش کردے جو اس کے دل کے طوفان کی طرح لہریں لے رہا ہے۔ لیکن اسی وقت پھر کوئی شخص سڑک سے یہ شعر گاتا ہوا گزرا:۔

میں اور شغل بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

اس سے قبل بارہا وہ اس شعر کو سن چکا تھا لیکن اتنا لطف کبھی نہ آیا تھا۔ اب اول مرتبہ اس کو کم نگاہی اور بزم شراب کا صحیح مفہوم معلوم ہوا وہ خود بھی بے اختیار ہوکر زرا بلند آواز سے اس شعر کو گنگنانے لگا اور بغیر اس خیال کے کہ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا خود ہی اس کی داد دینے لگا اور آپ ہی جھومنے لگا۔

اب اس کے لئے ایک جگہ بیٹھنا دشوار تھا، ایک خاص قسم کی بے چینی اور بیتابی اپنے اندر پا رہا تھا۔ وہ اُٹھا لیکن ہلکی سی لغزش قدم کے ساتھ، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ چلکر برآمدہ میں پہونچا جہاں بالکل تنہائی تھی وہ زیادہ اپنے آپکو نہ سنبھال سکا اور ایک آرام کرسی پر گرکر او نگلیاں اپنی ران پر اس طرح جلدی جلدی چلانے لگا جیسے کوئی پیانو بجا رہا ہے اسی سرمستی کے عالم میں اس کی نگاہ زہرہ کے اس مرمری مجسمہ پر پڑی جو برآمدہ کے ایک گوشہ میں قائم تھا مجسمہ کے سر پر بجلی کا قمقمہ روشن تھا اور اسکے چاروں طرف شاداب کھجوروں کے گملوں کا جھنڈ نہایت دلکش کنج کا منظر پیش کر رہا تھا وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور اسکی جھکی ہوئی نگاہوں کو اپنے لئے پنہاں نوید محبت سمجھ رہا تھا، مجسمہ کے اعضا کا تناسب سینے کا ابھار، کمر کی نزاکت چہرہ کی دلکشی آنکھوں کی پرچھایا سحر آفرینی، جا بجا اس کے جسم میں ناگن کا سا بل اور ہر بل کے ساتھ نرم نرم سی شکنیں۔ ایک ایسا منظر تھا کہ یوسف زیادہ تاب نہ لاسکا اور اٹھکر وہاں پہونچا اور تھوڑی دیر تک آہستہ آہستہ ہات سے مس کرنے کے بعد بے اختیارانہ اپنے لبوں کو اس کے لبوں سے ملا دیا۔ اس وقت وہ بیتاب تھا کہ اس کو اپنی آغوش میں کھینچ لے اس کو اپنے فشار سے چور چور کردے وہ سمجھ رہا تھا کہ دنیا اس وقت سنسان ہے۔ کائنات غیر آباد ہے اور تنہا وہی ایک آدم اس جنت ارضی کا مالک ہے۔ لیکن پشت کی طرف سے کسی نے آکر اس کے اس لذیذ خواب کے سلسلہ کو ختم کردیا ہوٹل کے خادم نے طشتری پیش کی جس پر ایک ملاقاتی کارڈ رکھا ہوا تھا۔

یوسف ـــ "میں نہیں جانتا کہ مس گارڈن کون ہے کیوں مجھ سے ملنا چاہتی ہے"؟ خادم، تھوڑے سے تامل کے بعد بولا کہ "مجھے نہیں معلوم کون ہیں، لیکن وہ کہتی تھیں کہ کسی ضروری کام سے آئی ہیں"

مس گارڈن ایک بازاری قسم کی اینگلو انڈین عورت تھی، جو ہوٹلوں کے خادموں سے ملکر اور ان کو انعام واکرام کی لالچ دلاکر ٹھہرنے والوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتی تھی اور بیوقوف بناکر خوب لوٹتی تھی۔ چونکہ عورت بہت صورتدار تھی اور تہذیب جدید کی کوئی ادائے دلربائی ایسی نہ تھی جس سے وہ واقف نہ ہو اس لئے بہت کم اس کا تیر خطا ہوتا تھا اور دارجلنگ آنے والے نوعمر امرا میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کا صید نہ ہوا ہو۔

نشۂ شراب یوں بھی ہر چیز کو اک خوشنما رنگ دیکر پیش کرتا ہے، چہ جائیکہ واقعی کوئی جمیل منظر سامنے آجائے۔ یوسف جسوقت

اندر کمرے میں داخل ہوا تو نشہ کا عروج اور اس کی بیباکیاں بدستور قائم تھیں اور تر دماغی کی وہ انتہائی کیفیت جو ہر چیز کو عبقری طراوت حسن کے ملبوس میں پیش کرتی ہے اس پر پوری طرح مستولی تھی۔ جس وقت یہ اندر پہونچا اور مس گارڈن کو، ایک نوجوان جمیل عورت کو جو سرے پاؤں تک رعنائی و شگفتگی تھی، دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید شراب کا ایک اور گلاس اس نے پی لیا ہے اور بدمست ہوکر بیہوش گرجانے کے لئے صرف زرا سے بہانہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جس وقت مس گارڈن کا نرم و نازک ہاتھ یوسف کے ہاتھ میں آیا تو یہ گویا بہانہ بھی ہات آگیا اور وہ کوچ پر گرکر اس طرح پڑ گیا جیسے اس کے اعضا سے قوت حرکت بالکل سلب کرلی گئی ہو۔

مس گارڈن جو اس وقت تک اپنا ایک خاموش تعارف صرف اس حد تک کرا چکی تھی کہ وہ ایک عورت ہے اور برق افگن عورت، یوسف کی اس حالت سے بہت خوش ہوئی، کیونکہ قدرت کی طرف سے اسے موقع ہاتھ آگیا تھا کہ وہ اسپر اپنا اثر جلد قائم کرے، چنانچہ اس نے یوسف کے سر کو بات کا سہارا دیکر ران پر رکھ لیا اور اپنا معطر رومال لیکر اس کے چہرہ و پیشانی کو ہوا دینے لگی۔ شرابی جب ایک بار گرجاتا ہے تو اس کا اُٹھنا آسان نہیں ہوتا اس لئے باوجود کوشش کے بھی یوسف بہت دیر تک اپنے آپ میں نہ آسکا، اور جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو مس گارڈن موجود نہ تھی۔ مگر اس کے کپڑوں کو خوشبو اس کے رومال کی عطریت اب بھی اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ یوسف کے لئے یہ تمام باتیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو، لیکن خمار کی تکلیف اس خواب کے خیال کی لذت کو بھی تباہ کردینا چاہتی تھی، اس لئے جب خادم آیا تو سب سے پہلے اُس نے جس چیز کی خواہش کی وہ شراب کا گلاس تھا۔

کیونکہ جس لطف و سرور کے ساتھ رات اُس نے بسر کی تھی وہ ایسا نہ تھا کہ پھر اس کی تکرار کی خواہش اس کو نہ ہوتی وہ چاہتا تھا کہ اسکی زندگی اک سکر دوام میں تبدیل ہوجائے اور ساری دنیا میں وہ معصیت کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

(باقی)

نیاز

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے، دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے۔ ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ فہرست اردو یا انگریزی کی منگاکر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے

ملنے کا پتہ

محمد حسین اینڈ کونٹریکٹر مرچنٹ فتحگڑھ یو۔پی

تذکرہ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر

یعنی

محمد حسین آزاد کے ادعائے باطل

اور

اُن کے طامات و ترہات کا کشف حجاب

اردو کے دنیائے تذکرہ میں جو شہرت محمد حسین آزاد کی تالیف آبحیات کو دور آخر میں ہوئی، اس سے غالباً کوئی شخص ناواقف نہ ہوگا لیکن اس حقیقت سے کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ وہی مذکرہ، جو بعض جماعتوں کے نزدیک شاید اب بھی معجزۂ ادب و تحقیق سمجھا جاتا ہے اور جو نہ صرف اپنی انشا بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی "فاتوا بسورۃ من مثلہ" کا بت بنا لیا گیا ہے، اس کو اگر نظر تحقیق اور نگاہ حقیقت شناس سے دیکھا جائے تو بیدل کے یہ فقرے بے اختیار سامنے آجاتے ہیں کہ :-

"غبارے سطر آشفتگی بر ہوا نگاشت دانست نسخی طومار کہکشا تم پر کاہے بنیاد
فطرت برباد گزاشت، پنداشت مصنف کتاب آسمانم"

"آبحیات" اگر اپنی انشا کے لحاظ سے تیسرے درجہ سے بھی گری ہوئی چیز ہوتی تو چنداں مضایقہ نہ تھا، کیونکہ ادیب ہونے کی حیثیت سے آزاد کا کوئی کارنامہ قابل ذکر موجود نہیں ہے، رہا ذوق شعری، سو اس اعتبار سے تو خیر، غریب کا مرتبہ ایک "متشاعر" کے درجہ کو بھی نہیں پہونچتا، لیکن طرفہ مضمون یہ ہے کہ آبحیات کو ایک تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے تنقید عالی کا بیش بہا صحیفہ بنا کر سامنے لایا گیا ہے، در انحالیکہ اس لحاظ سے وہ ایک مجموعۂ موضوعات و مزخرفات سے زیادہ نہیں اور اس اعتبار سے وہ ایک ایسی جنس کاسد ہے جسکی قدر کم از کم آنکھ رکھنے والوں کے بازار میں تو ہو نہیں سکتی

آبحیات کے طرز تحریر اور ان کے موضوع مقدمہ سے بحث کرنا اس وقت میرا مقصود نہیں ہے، ہر چند یہ بھی نہایت ضروری و اہم کام ہے، مگر ممکن ہے یہ سعادت کسی اور شخص کے حصہ میں آئے، ہو بہر حال اس صحبت میں مجھے تاریخی و تنقیدی اہمیت کے لحاظ اس تصنیف کی حقیقت پر روشنی ڈالنا ہے اور بتانا ہے کہ یہ بدیعۂ تاریخی، سخافت و دنارت کا کتنا عظیم الشان انبار ہے۔

اگر آبحیات کے متعلق میری رائے اختصار کے ساتھ طلب کی جائے تو میں ایک لمحہ تامل کئے بغیر یہ کہدونگا کہ واقعات

کی تحریف، حقیقتوں کی تکذیب صداقت کی توہین اور باطل کی تائید کا جیسا کھلا ہوا منظر اس کتاب میں نظر آتا ہے، وہ مشکل ہی سے کسی اور تصنیف میں مل سکتا ہے، اور جس بری طرح آزاد نے اپنے بطون کو اس کتاب کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے اس کی نظیر کتب تذکرہ و تاریخ کی فہرست میں تو کہیں مل نہیں سکتی، ممکن ہے تیسری چوتھی صدی ہجری کے واضعان حدیث اس باب میں ان سے بڑھ گئے ہوں

یہ مضمون میری اسی مختصر رائے کی تفصیل اور میرے اسی دعوے کی دلیل ہے، جس سے اعتبار و بصیرت کی توقع تو نہیں، لیکن یہ امید ضرور کی جاتی ہے کہ اسلاف کی روحوں کی طرف سے جن کے حق میں یہ تالیف ایک بہتان عظیم سے کسی طرح کم نہیں ہے شاید یہ ایک جائز انتقام ہو جائے۔

آبحیات کے طومار اغلاط پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کی چار تقسیمیں ہو سکتی ہیں:-

(۱) وہ تحریفات جن کے ذریعہ سے بعض اکابر پر بد اخلاقی کی تہمت تراشی گئی ہے۔

(۲) وہ روایات جو مصنف کے جہل و ناواقفیت پر دال ہیں۔

(۳) وہ بیانات جو یا تو یکسر غلط ہیں یا حد درجہ ضعیف۔

(۴) وہ اشعار جو آزاد ہی کی طبع رسا کا نتیجہ ہیں لیکن انھیں منسوب کیا ہے دوسروں کے نام سے

میں ان قسموں کو علٰحدہ کر کے مثالیں پیش نہیں کروں گا، بلکہ شروع سے تمام ان شاعروں کے حالات کے متعلق تنقید کروں گا جن کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ کہاں کہاں کس قسم کی غلطی آزاد نے کی ہے۔

ولی

آزاد نے ان کا نام شمس ولی اللہ لکھا ہے، حالانکہ ان کے نام و لقب میں بہت اختلاف ہے۔ میر تقی میر نکات الشعراء میں صرف ولی لکھتے ہیں، میر حسن اور مولوی عبدالغفور نساخ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں گلشن بیخار میں کوئی نام درج نہیں، تذکرہ گل رعنا میں لقب شمس الدین اور نام ولی اللہ لکھا ہے۔ آزاد نے نہ ان تمام اختلافات کو ظاہر کیا اور نہ کوئی معقول وجہ بتائی کہ ان کو شمس ولی اللہ پر کیوں اعتماد ہے۔

ولی کو قریب قریب تمام تذکرہ نویسوں نے ایک مرد صاحبدل تسلیم کیا ہے یہاں تک کہ لفظ شاہ ان کے نام کے ساتھ ضم ہو گیا خود انھوں نے بھی اپنے رسالہ نور المعرفت میں اپنے آپ کو "محمد نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاکپا" تحریر کیا ہے، لیکن آزاد کا انداز بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:-

> "قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی کے خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں، اسوقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا، جس سے تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے،
>
> دوسرے وہ خود فقر کے خاندان عالی میں سے تھے اور فقیر ہی کے دیکھنے والے بھی تھے، تیسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشہ اور فارسی بھی صوفی ہیں،

ان جذبوں نے انھیں تصوف شاعرانہ میں ڈالا"

آزاد کی یہ عبارت اپنے الفاظ و معنے کے لحاظ سے جیسی لغو و مہمل ہے اس پر تنقید کی ضرورت نہیں، عیش و نشاط کی فراوانی کے ساتھ تصوف کا پیدا ہونا اس قدر عجیب و غریب دعویٰ ہے کہ آزاد کے سوا کوئی اسے پیش نہیں کر سکتا لیکن چونکہ آزاد کا مقصود نشر تصوف اور اسی کے ساتھ ولی کی توہین مقصود تھی، اس لئے انھوں نے یہ اپج کی لی اور خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور دنیا اُسے کیا سمجھے گی۔ آگے چلکر ان کے دل کا کانٹا زیادہ نمایاں طور پر زبان سے نکلتا ہے لکھتے ہیں:-

"ہماری زبان کے مورخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دنیا داری۔ یا گوشہ گیری۔ اقامت۔ یا سیاحی معلوم ہوں"۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ولی کی سیاحت۔ یا طلب علم۔ یا اخلاق و عادات کا حال نہیں ملتا۔ انصاف سے دیکھئے تو تصوف سے ان کے اخلاق و دنیا داری وغیرہ سب باتوں کا پتہ چل جاتا۔ مگر تصوف کو وہ اس قدر لایعنی لغو اور فضول سمجھتے ہیں کہ ولی کے دیوان کے بارہ میں یہ جملے ان کے زہر آلود قلم سے نکل جاتے ہیں:" غرض جب ان کا دیوان دلی پہونچا۔ تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا......گیت موقوف ہو گئے قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہنکر ہماری زبان میں آیا۔ مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا اور اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستہ سے نہیں آیا۔ بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑکر آ گیا تھا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا" آزاد کے ایک ایک فقرہ سے جو زہر ٹپک رہا ہے اس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔

آزاد نے ولی کو اردو کا پہلا شاعر مانا ہے اور چاسر، رودکی اور مہلہل کا مرتبہ دیا ہے۔ گو وہ یہ مانتے ہیں کہ اردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ مگر پھر بھی وہ مندرجۂ ذیل خصوصیات کو ولی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اردو میں لائے۔ شعر کو غزل غزل کو ردیف و قافیہ سے سجایا۔ ردیف دار بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی قطعہ مخمس اور مثنوی کا رستہ بھی نکلا۔ حالانکہ ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں۔ تخمیناً سو سوا سو برس پہلے سے یہ سب اصناف موجود تھیں۔ یہ راز طشت از بام ہو چکا تھا کہ محمد قطب شاہ، قلی قطب شاہ، اور عبد اللہ قطب شاہ کے دیوان حیدر آباد میں موجود ہیں۔ نصرتی کا دیوان اگرچہ نایاب ہے، مگر زبیری نے بساطین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جس میں قصاید بھی شامل ہیں اور بعض قصاید کا دیکھنا مولانا عبد الحی صاحب مولف تذکرہ گل رعنا نے بھی بیان کیا ہے اسی طرح مثنوی پھول بن جو نشاطی کی تصنیف ہے ۱۰۶۶ھ میں تصنیف ہوئی بلکہ اس کی زبان اس قدر صاف ہے جس کی اس زمانہ میں کبھی امید نہیں کی جا سکتی نمونہ کے لئے یہ چند شعر دیکھیے۔

اول میں حمد رب العالمیں کا   دل و جانسے کہوں جاں آفریں کا
خداوندا تجھے ہے جم خدائی   ہمیشہ تجھکو ساجے کبریائی

زباں کو میں ادب کے ساتھ کھولوں — نبی کے جانشیں کا مدح بولوں
علی سارے نیاں میں ہے سپہدار — علی سارے دلیاں میں ہے سردار

جو کوئی ہے باغباں اس پھول بن کا — چمن لاتا ہے یوں تازے سخن کا

نہ تھا بیٹا سو کوئی اس شاہ کے گھر — ہوا تھا راج بیٹی پر مقرر

اسیطرح غواصی کا فسانۂ سیف الملوک نظم اردو ۱۰۲۶ھ کی تصنیف ہے جس کی نسبت وہ خود کتاب مذکور میں لکھتا ہے

برس اک ہزار ہور ستاویس ۱۰۲۷ھ میں — کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

نیز طوطی نامہ ملا ضیاء الدین نخشبی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف ہوا جس کے آخر میں خود مصنف نے لکھا ہے

برس اکہزار اور چالیس پہ نَو — ہوے تھے یہ موتیاں پروہا ہوں تو

۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصایح کا زبان دکنی میں ملا قطبی نے ترجمہ کیا۔ ۱۰۶۷ھ میں ایک مثنوی ماہ پیکر احمد جنیدی نے لکھی شاہی شاہ قلی خاں تانا شاہ کے مصاحب خاص تھے اور مرثیے بھی کہتے تھے غزل بھی کہتے تھے۔ تذکرہ میر حسن اُن کی غزل کا نمونتاً یہ شعر درج کرتا ہے

ملنا تمہیں کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے — کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

غرضکہ تمام اصناف سخن کے نمونے مکمل طریقہ سے زبان اردو میں موجود تھے۔ بحریں وہی تھیں جو فارسی میں مروج تھیں چنانچہ طبعی اور نشاطی کی مثنوی ہزج مسدس محذوف الاخر۔ غواصی کی بدیع الجمال اور سیف الملوک بحر متقارب۔ بحری کی مثنوی من لگن، ہزج۔ اخرم۔ و اشتر میں موجود ہیں۔ اسیطرح غزلیں اور مخمس دوسری بحروں میں پائے جاتے ہیں۔ اور آزاد کے اس خیال سے کہ ولی ہی نے سب بحریں اردو میں پیدا کیں کبھی صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے ولی کا وطن، احمد آباد گجرات بیان کیا ہے حالانکہ تذکرۂ میر میں انہیں اورنگ آبادی لکھا ہے تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ آبحیات میں ان کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے۔ گر اسبات کی کوئی تاریخی سند نہیں۔ اسیطرح تذکرہ آصفی اور تذکرہ دکن ان کو احمد آبادی بتاتے ہیں۔ تذکرہ میر حسن میں ان کو گجراتی کہا گیا ہے اسیطرح آبحیات میں اُن کی سنہ ولادت اور سنہ وفات کو قریب قریب بالکل حذف کر دیا ہے۔ حالانکہ دوسرے تذکروں میں اختلافی طریق پر یہ سنین درج کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے تو آزاد کے اس جملے کی وقعت کسی طرح بھی قائم نہیں رہتی کہ وہ شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں تھے۔ کیونکہ وہ گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کے بعد ان کا خاندان بیجاپور

چلا آیا تھا ممکن ہے کہ ولی کی کوئی دور کی قرابت اُن سے ہو۔

ولی کی شاگردی کے متعلق بھی آزاد نے ایسی ہی فضول بے سر دپا تقریر کی ہے جیسی کہ ان کی عادت ہے۔ لکھتے ہیں کہ ابوالمعالی (اِن کے نام کے ساتھ سے سید کا لفظ اڑا دیا ہے) کے ساتھ دلی آئے۔ یہاں شاہ سعداللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح بھی لی ہو۔" حالانکہ دوسری جگہ خود ولی کی زبانی یہ بات بیان کرتے ہیں کہ "میں شاہ سعداللہ گلشن کا شاگرد ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں"۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں "دیوان کی ترتیب یقیناً اُن کے اشارہ سے کی"۔ حالانکہ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ولی کو ہدایت کی کہ "این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ دیوان اردو کی ترتیب۔ دیوان کا حرف بحرف شاہ صاحب کو سنانا۔ شاہ صاحب کی شاعری کے متعلق ہدایات وغیرہ۔ اور اسپر آزاد کی یہ ناواقفیت کہ معلوم نہیں کس بات میں شاگرد تھے۔ ایسی بوالعجبی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ اتنی ہدایتوں کے بعد ان کو صرف شاعری ہی میں شاہ صاحب کا شاگرد قرار دیا جا سکتا ہے۔

سب سے بڑا ستم جو آزاد نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ میر تقی میر کے تذکرے میں ان کے تذکرے کا ذکر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میر نے ولی کے متعلق لکھا ہے " ولی شاعرے است از شیطان مشہور تر" اور اس کے ساتھ ہی ایک فرضی افسانہ میرخاں کمترین کا بیان کر دیا ہے میں نے تذکرۂ میر کو اول سے آخر تک دیکھا لیکن یہ فقرہ کہیں نہ پایا بلکہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ" از کمال شہرت حاجت تعریف ندارد" یا اُحوالش کماینبغی معلوم من نیست"۔ اس کے سوا کوئی خلاف شان فقرہ یا جملہ ولی کی بابت نہیں ہے۔ مگر آزاد کا تو مطلب ہی کچھ اور تھا اس لئے انھوں نے آخر کار انھیں شیطان ہی بنا دیا۔

شاہ مبارک آبرو ان کے بارہ میں بھی آزاد نے اپنی عادت جاریہ کی موافق بہت زیادتیاں کی ہیں۔ ایک لطیفہ بیان کیا ہے کہ چونکہ یہ یکچشم تھے اسی لئے مرزا مظہر علیہ الرحمۃ نے انپر چوٹ کی اور یہ شعر کہا۔

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے   آبرو سب شاعروں کی . . . ہے

اور اُنھوں نے جواب میں یہ کہا۔

کیا کروں حق کے کئے کو کور میری چشم ہے   آبرو جگ میں رہے تو جان جاناں . . . ہے

اصل واقعہ یہ ہے کہ آزاد کو دونوں شاعروں پر سب و ستم کرنا منظور تھا جسے ایک لطیفہ کی صورت سے پورا کیا۔ ورنہ بجز اسبات کے کہ آبرو کے یکچشم ہونے کا ثبوت تذکروں سے ملتا ہے۔ قدما کے جسقدر تذکرے میری نظر سے گزرے کسی میں یہ واقعہ درج نہیں ہے۔ دوسری یہ بات بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ مرزا جان جاناں مظہر جن کی سنجیدگی کے تمام اہل تذکرہ قائل ہیں اور جن کی تمام عمر زہد و ورع میں بسر ہوئی، کبھی ایسی نازیبا حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح آبرو خود ایک کہن سال بزرگ تھے اُن سے ایسی خلاف تہذیب حرکات کا سرزد ہونا ممکن نہیں۔ یہ غیر مہذب لطیفہ اور ناقابل برداشت تہمت رکھکر بھی آزاد کا جی خوش نہیں ہوتا، بلکہ وہ پیر کہن باکباز کے ساتھ شاہ مبارک کے عشق کا ایک فرضی افسانہ گھڑتے ہیں، جس کا ذکر کسی تذکرے میں اشارۃً

بھی نہیں ہے۔ ایک جگہ آزاد لکھتے ہیں کہ "آبرو ایک بڑے شاعر تھے اور اسیطرح مکھن پاکباز کے حال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معاصر شاعر تھے جن کا تین ہزار شعر کا ایک دیوان یادگار ہے۔ یہ ایک خوش وضع شکیل اور نہایت عابد و زاہد شخص تھے" اور پھر دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں کہ "ان کے شعر جب تک میر مکھن پاکباز کے کلام سے چپڑے نہ جائیں تب تک مزا نہ دیں گے"۔ اور اس واقعہ کو چمکانے کے لئے ایک شعر مکھن کا آبرو کے شعروں میں شامل کرکے یوں لکھتے ہیں "پہلے ایک شعر انکا لکھتا ہوں۔ اس زمانہ کے خیالات پر خیال کرو

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میری میاں صاحب خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

اس شعر کو آبرو کے کلام کا آغاز ٹھرانا اور ان فقروں کے بعد لکھنا صاف بتاتا ہے کہ آزاد آبرو پر ان اتہامات کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، جو پہلے ان کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ پڑھنے والا وہیں پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے اور یہ آبرو کا ایک مزاحی شعر معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے میر مکھن کے لئے کہا ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ یہ شعر میر مکھن پاکباز کا ہے جو غالباً انھوں نے اپنے کسی بزرگ کی شان میں کہا ہے۔ آزاد نے تک بندی اور واقعات کو مسلسل کرنے کے لئے اس کو ذرا الفاظ کا پہلو بچاکر آبرو کے کلام میں شامل کر دیا۔ یہ تمام طوفان غالباً اس شعر پر اٹھایا گیا ہے۔

مکھن میاں خفا ہیں فقیر ونکے حال پر آتا ہے ان کو جوش جمالی کمال پر

غالباً مکھن میاں کسی سے خفا ہوئے ہیں اور آبرو نے واقعہ نگاری کے طریق پر یہ لکھدیا ہے۔ ورنہ میر مکھن ایک گوشہ نشین شخص تھے جن کا حال نکات الشعراء میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"پاکباز تخلص شخصے است گوشہ نشین۔ بسیار کم اختلاط۔ گویا آشنا شدن را نمیداند۔ پسر میاں شاہ کمال نبیرۂ شاہ جلال در مجمع شاعران ریختہ کہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ قرار یافتہ است اگر دماغ وفا می کند تشریف می آرد۔ مزاجش خالی از وحشت نیست"

میر محمد شاکر ناجی ان کی نسبت تذکرۂ میر حسن میں لکھا ہے کہ "مردے ظریف طبع بود اکثر از لطائف ظرایف مردماں را خندہ می آورد و خود نمی خندید۔ مگر تبسمی میکرد متوطن شاہجہان آباد بود تلاش صنعت ایہام بسیار داشت" میر تقی میر نے لکھا ہے کہ "مزاجش بیشتر مائل بہزل بود"۔ مگر آزاد نے ان دونوں بیانوں سے قطع نظر کرکے ان کو ایک عجیب قسم کا فسادی آدمی بناکر دکھایا ہے ملاحظہ ہو۔ "تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جسکے گرد ہوتے تھے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔

یکرنگ آزاد نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ آخر میں کلام اپنا مرزا جان جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے۔ مگر دراصل یہ خان آرزو کے شاگرد تھے جیسا کہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے اگرچہ مصحفی نے ایک قول کیموافق انہیں شاہ مبارک ہی کا ساگرد بتایا ہے۔ مگر اس قول کی تذکرہ میر حسن سے تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کو میاں آبرو کا معاصر لکھتے ہیں میر تقی میر یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھے انکے حال سے اچھی طرح آگاہی نہیں اور پھر بھی آبرو کا معاصر ہی کہتے ہیں۔ کم از کم آزاد کیلئے ان اختلاف کا اظہار ضروری تھا انکے نام میں بھی اختلاف ہے بعض تذکرہ نویسوں نے مصطفےٰ خاں لکھا ہے۔ مگر علی الرغم سب کے میر حسن نے مصطفےٰ قلی خاں نام لکھا ہے

اشرف علیخان فغاں فغاں کی بابت آزاد نے لکھا ہے کہ مصحفی اپنے تذکرہ میں انہیں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھتے

ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے مصحفی کے الفاظ یہ ہیں: "شعر را بہ صفائے میگوید - و نسبت شاگردی بہ ندیم میرساند چنانچہ خود گفتہ

ہرچند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہوگیا

اگرچہ نکات الشعراء میں قزلباش خاں اُمید کا شاگرد لکھا ہے - مگر یہ شاید فارسی کے کلام کی بابت ہوگا ورنہ اردو میں فارسی کے حوالے کی ضرورت نہ تھی -

دوسری غلطی یہ ہے کہ آزاد کہتے ہیں: "ایک دن اختلاط میں انکا کپڑا نواب کے ہاتھ سے جلگیا - یہ رنجیدہ ہوکر عظیم آباد چلے گئے" اور واقعہ دراصل یہ تھا کہ نواب نے ایک دن جوش اختلاط میں گرم پیسے سے انکا ہاتھ جلا دیا تھا - یہ واقعہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے - اور مصنف تذکرۂ گلِ رعنا بھی اُسکی توثیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں معلوم نہیں آزاد نے کپڑے کی روایت کہاں سے لی ہے -

مرزا جانِ جاناں

آزاد لکھتے ہیں کہ "اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرت کلام کے لحاظ سے میر اور سودا کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے لیکن چونکہ صانع قدرت نے طبیعت کی لطافت اور اصلی نفاست اور ہر بات میں انداز کی خوبی اور خوبصورتی ان کے مزاج میں رکھی تھی اور زمانہ بھی سبکا ایک تھا - اس کے علاوہ پُرانے پُرانے تذکرہ نویس لکھتے ہیں بلکہ بزرگوں کی زبانی بھی سنا کہ زبان کی اصلاح اور طرز کی ایجاد میں انہیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا و میر کو"

مندرجۂ بالا عبارت کے ایک ایک حرف سے آزاد کی ناانصافی اور جانب داری ظاہر ہوتی ہے یہاں اُن کو کلام کی کثرت اور جوش و خروش کی عدم موجودگی کی شکایت ہے - مگر میر حسن خلیق اور میر ضاحک کے یہاں وہ دونوں چیزیں بڑی آسانی سے ملگئی ہیں حالانکہ میر ضاحک کا صرف ایک شعر - اور میر خلیق کے دو شعر ملے ہیں - مگر اللہ اللہ ذرا حالات لکھنے کے لئے اضطراب تو ملاحظہ ہو میر ضاحک کے حال میں لکھتے ہیں: "ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں - مگر بھول ہاتھ نہ آئے جو لڑی پروتا - اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دل افسردہ کے طاق میں پڑے تھے انہیں کا سہرا بناکر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں" میر ضاحک جو کبھی ایک نقل محفل سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے - اور جنکو مسخرگی کے سوا اور کچھ بھی نہ آتا تھا جن کی شاعری پر میر حسن بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے میر خلیق جو اپنے زمانہ کے ایک معمولی مرثیہ گو تھے - یوں اُن کی نظروں میں جگہ پائیں اور مرزا جانجاناں سا باکمال جسکے علم و فضل کا ایک زمانہ مقر ہے یوں انکی نگاہوں سے گر جائے پیچ ہے -

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

ان کی توجیہات ملاحظہ کیجئے تو ہنسی آتی ہے - مولوی قدرت اللہ کے تذکرہ میں جو ۱۲۲۳ھ میں تالیف ہوا ہے صاف صاف لکھا ہوا ہے: "میگویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلے شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ - زبدۃ العارفین - قدوۃ الواصلین - واقف رموز جناب اکبر کاشف طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر است"

مصحفی بآواز بلند کہہ رہے ہیں "در ابتدائے شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دور دور ایہام گویاں بود اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ و دست نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا ست بعدہ نقش بہ دیگراں رسیدہ"

میر تقی میر جوش عقیدت میں کہتے ہیں "بندہ بخدمت اور فتہ سعادت اندوز گشتہ است اکثر اوقات دریا دالہی صرف میکند خویش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است۔ از سلیم و کلیم پائے کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ اوست۔ لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز مے شود" اکابر ادب کی تو رائیں یہ ہیں مگر آزاد نہایت شیریں لہجہ میں یوں زہر افشانی فرماتے ہیں "ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں گے۔ لیکن وہ ایک زمانہ تھا کہ صفات مذکورہ داخل فضائل تھیں۔ کچھ تو اس اعتقاد سے کہ ع خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔ اور کچھ اس سبب سے کہ اگر ایک لطیف اور شفاف سطح پر کوئی داغ ہو اور وہ ایک عمدہ نظر گاہ میں جلوہ گر ہو تو وہاں وہ دھبا بدنما نہیں بلکہ گلکاری معلوم ہوتا ہے اور جسے بُرا معلوم ہو وہ خوش عقیدہ نہیں۔ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں مگر مقتضائے زمانہ پر نظر کر کے نمونہ پر اکتفا کرنا چاہیے" مگر اس پر بھی صبر نہیں آتا۔ اور تاباں کا تعلق مرزا مظہر کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں "مرزا صاحب بھی چشم محبت اور نگاہ شفقت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور ان کی صحبت میں جہاں کبھی وعظ و ارشاد اور کبھی نظم و اشعار کا جلسہ رہتا تھا تاباں بھی حاضر تھے اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب سے گرمجوشی ظاہر نہ کرتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہیں اور سارے خوشی کے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ تاباں بھی مزاجداں تھے اشعار اور لطائف رنگین کہتے حضرت سن سن کر خوش ہوتے کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی تو جو اہل عقیدت میں ادب کا طریقہ ہے اسی طرح دست بستہ عرض کرتے کہ کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں۔ حضرت مسکرا کر اجازت دیتے۔ وہ کان کے پاس منہ لیجاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ جسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کیا ہو۔ پس حضرت مسکراتے اور فرماتے کہ درست ہے پھر وہ اسی قسم کی کچھ باتیں کہتے آپ فرماتے یہ بالکل درست ہے جب تاباں اپنی جگہ پر آبیٹھتے تو پھر حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا تمہیں خیال نہیں رہا۔ تاباں پھر کان کے پاس منہ لیجاتے اس وقت اس سے بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے اور اپنے پیارے عزیز کی مہربانی کا لطف حاصل کرتے" میں نے جہانتک تلاش کیا کوئی تذکرہ اس واقعہ کی شہادت نہیں دیتا میر تقی۔ یا میر حسن وغیرہ میں اس کا ذکر بھی نہیں اس لئے یہ ایک صریح اتہام ہے۔ اصلیت صرف اتنی ہے کہ تاباں مرزا صاحب کے ایک عقیدتمند مرید تھے۔ اور مرزا صاحب ان پر عنایت فرماتے تھے۔ مگر جو شخص پیر و مرید کے آداب سے واقف ہی نہ ہو وہ اگر یہ خرافات نہ لکھے تو کیا کرے۔ اس قصہ کو صرف اس لئے گھڑ لیا گیا ہے کہ میر عبد الحئی تاباں نہایت جمیل تھے۔ اور مرزا کی مریدی کا شرف انہیں حاصل تھا۔ ابتدا حال میں انہیں میگساری کی بھی عادت تھی جس سے آخر میں تائب ہو گئے تھے میرزا کی نسبت جو اور لطایف لکھے ہیں وہ بھی اس سے کم نہیں ہیں چنانچہ نواب صاحب والا لطیفہ۔ اور چارپائی کی کان والا قصہ جسکے ذریعہ سے

بجائے نفاست طبع کے مرزا کو مجنون ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح انشائے جو اپنی خوش عقیدگی کے ثبوت میں حکایت بیان کی ہر آزاد اس کو مرزا علیہ الرحمۃ کی عاشق مزاجی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ڈھونڈنے سے بھی یہ قطعہ مجھکو سودا کے کلیات میں نہیں ملا، مگر آبحیات میں لکھا ہے کہ مرزا رفیع السودا نے اپنی آزادی اور بیباک روی کی زور میں آکر مرزا جان جاناں کی ہجو میں یہ شعر بھی لکھا ہے۔

القصہ اسکا حال یہی ہے جو سچ کہوں ۔۔۔ کتا ہے دہوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

اسپر آزاد نے ایک خلاف عقل حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ مرزا مظہر نے ایک دہوبن گھر میں ڈالی تھی اس واقعہ کا بھی کہیں ثبوت نہیں ہے

آخر میں مرزا صاحب کی شہادت کے متعلق بھی تذکرۂ قاسم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے اسپر بگڑ کر کسی سنی نے یہ حرکت کی"۔ افسوس ہے کہ تذکرۂ قاسم اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ ممکن تھا کہ اور سب باتوں کی طرح یہ روایت بھی غلط ثابت ہوتی اور اگر بالفرض یہ کہنا صحیح بھی ہے۔ تو دوسرے تذکروں (گلشن بیخار۔ سخن شعراء۔ وغیرہ) کے مقابلہ میں ایک تذکرہ کو ترجیح نہیں دیجاسکتی۔ تیسرے یہ کہ حضرت علی کی مدح کسی اہل سنت کے نزدیک عیب یا گناہ نہیں بلکہ فخر و صواب ہے پھر یہ کیونکر قرین قیاس ہوسکتا ہے کہ کسی سنی سے یہ حرکت سرزد ہو۔

افسوس کہ وہ مرزا جان جاناں جنھوں نے اپنا خون اپنے قاتل کو بحل کردیا ان کے واقعات زندگی کے لکھنے میں تحریف دانستہ سے کام لیکر آزاد نے قاتل کی طرح انصاف کا خون اپنی گردن پر لیا۔

تاباں

آزاد نے تاباں کو شاہ حاتم اور میر محمد علی حشمت کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن تذکرۂ گلشن بیخار میں اُن کو سودا کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ اگرچہ میر کی اس تنقید کی وجہ سے کہ "بہ نسبت بہ شعرا داستا داو ارتبۂ شاگردی او نبود" وہ محمد علی حشمت ہی کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ میر صاحب سودا کو ایک بڑا شاعر مانتے تھے وہ تاباں کو سودا پر ترجیح نہ دیتے اور بعض نے میر درد کا شاگرد بھی بیان کیا ہے

تاباں کو تمام تذکرہ نویس متفقہ طور پر نہایت حسین و جمیل لکھتے ہیں۔ اور آغاز شباب ہی میں انکا مرجانا بیان کرتے ہیں۔ مگر آزاد ایک واقعہ اور اختراع فرماتے ہیں کہ "زمانہ اور وقت کے خیالات کو دیکھنا چاہیے کہ بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے انھیں بھی خبر ہوگئی بنے سنورے اور بازار کیطرف مونڈھا بچھا کر آ بیٹھے۔ بادشاہ جب اس مقام پر پہونچے تو اس لئے کہ ٹھہرنے کو ایک بہانہ ہو وہاں آبحیات مانگا اور پانی پیکر دیکھتے ہوئے چلے گئے"۔ بہ فرض محال اگر یہ روایت کسی تذکرہ میں ہو بھی تو درایتاً ہرگز صحیح نہیں ہوسکتی۔ بادشاہ کا ایک نوعمر خوبصورت لڑکے کو دیکھنے کے لئے جانا خلاف عقل ہے۔ اگر واقعی بادشاہ کو دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا تو کون مانع تھا کہ ان کو دربار میں نہ بلوالیتے دوسرے آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا اشتیاق و ارادہ اسقدر شہرت پا گیا تھا کہ اسکی خبر مشتہر عام ہوتے ہوتے تاباں کو بھی پہونچ گئی تھی۔ پھر بادشاہ کا ارادہ کرکے تاباں کے مکان کی طرف جانا۔

اور وہاں ٹھہرنے کے لئے پانی کا بہانہ کرنا۔ آزاد کو یہ ضعیف اور ناقابل قبول روایت بیان کرکے یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ وہ تاباں جسکو ہر کہ دمہ اس وقت یوسف ثانی کہتا تھا۔ وہ تاباں جس کے اشتیاق میں بقول ان کے بادشاہ تک کوچہ گردی کرتے تھے۔ وہ تاباں جن کی ہر دلعزیزی کیوجہ سے بقول اکثر تذکرہ نویسوں کے کسی بڑے سے بڑے امیر کی محفل خالی نرہتی تھی۔ اگر ان کو اپنا ——— عقیدت کیش سمجھکر مرزا جان جاناں بھی محبت کرتے تھے تو کیا بُرا تھا۔ انھوں نے باوجود اس کے کہ مظہر کے کلام میں اس قسم کی نو یات کا ذکر نہیں پایا پھر بھی اُن کو ایک سنگین گناہ کا مرتکب بنایا۔ مگر افسوس ہے کہ میر کی اس فریاد وفغاں پر ذرا توجہ نہیں کی ؎

داغ ہے تاباں علیہ الرحمۃ کا چھاتی پہ میر — ہو نجات اُسکی بچارا ہمسے بھی تھا آشنا

میر کا اس محبت و احترام سے تاباں کا ذکر کرنا دلیل ہے اس امر کی کہ تاباں اپنے اخلاق کے لحاظ سے کس قدر بلند انسان تھا ورنہ میر جس نے خوبرو لڑکوں کا ذکر نہایت بے غیرتی کے ساتھ کیا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ رعایت نہ کرتے۔

مرزا سودا

سودا کے تخلص میں بھی آزاد نے عجیب منطق سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا اسواسطے رکھا گیا ہے کہ سودا یا جنون تمغائے عشق ہے جسپر ایشیائی شاعری کا دارومدار ہے یا پھر باپ رعایت سے رکھا گیا ہے کہ اس کے جزو اول میں سودا داخل ہے اور اس نقرے کا تو جواب ہی نہیں کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی

آزاد نے مرزا رفیع سودا کی ولادت ۱۱۲۵ھ لکھی ہے اور ۱۱۸۵ھ میں انکا لکھنؤ پہونچنا۔ اس حساب سے انکی عمر ساٹھ برس کی ہوتی ہے مگر وہ اپنے قول سے خود اپنے قول کی تردید کرتے ہیں کہ ساٹھ یا چھاسٹھ برس کی عمر میں دلی سے نکلکر فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے معلوم نہیں یہ شبہ اُن کو کس بنا پر پیدا ہوا ہے ——— اسی کے بعد یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ جب یہ نواب شجاع الدولہ سے ملے تو وہ ان سے بہت اعزاز سے پیش آئے لیکن بے تکلفی یا طنز سے ان سے کہا کہ مرزا وہ رباعی تمہاری ابتک میرے دلپر نقش ہے۔ اور اس کو مکرر پڑھا۔ انہیں اپنے حالپر بڑا رنج ہوا۔ اور یہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہانتک کہ شجاع الدولہ مرگئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔

رباعی کا قصہ یوں بیان کیا ہے کہ ان کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے برادر من شفق مہربان من لکھکر خط معہ خرچ سفر بھیجا اور طلب کیا۔ انہیں دلی کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔

سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک — آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے — بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آزاد نے نواب شجاع الدولہ کا لکھنؤ میں رہنا بیان کیا ہے حالانکہ نواب شجاع الدولہ کبھی لکھنؤ نہیں رہے بلکہ ان کا مسکن فیض آباد تھا۔ اور یہیں ان کی آخری عمر تمام ہوئی۔ اسیطرح وہ براہ راست لکھنؤ کا آنا بیان کرتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ فرخ آباد سے ۱۱۸۵ھ میں جب نواب مہربان خاں کا انتقال ہوا تب یہ فیض آباد آئے آگے چلکر سودا کی وضعداری کے لئے جو لطیفہ تراشا گیا ہے وہ صحیح

نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص دلی سے سفر کرکے گرتا پڑتا فیض آباد جائے اور وہاں پہونچکر ایک نہایت معمولی بات پر بدل ہو کر بیٹھ رہے یہ بالکل ناممکن ہے۔

کلیات سودا کو دیکھئے اکثر قصیدے نواب شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب کائنات پہلی ہی دفعہ میں پیش کردی گئی ہو۔ مصحفی ان کے حال میں لکھتے ہیں "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت می یافت نواب مرحوم و مغفور نیز بودن اورا در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند" ظاہر ہے کہ یہ فقرے اسیوقت لکھے جاسکتے ہیں جب سودا نواب مرحوم کی حین حیات تک اُن کے دربار میں رہے ہوں۔ مگر آزاد کو سودا کا استغنا دکھانا منظور تھا آزادی کے ساتھ جو جاہا لکھدیا۔

آزاد نے سودا کے دلی کے قدردانوں میں مہربان خاں کا نام لکھا ہے۔ مگر دراصل یہ مہربان خان رند ہیں جو فرخ آباد کے ایک سیر چشم۔ دریا دل امیر تھے اور جن کی فیاضی سے سودا نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جس طرح سودا ان کے پاس رہے اسیطرح میر سوز مدت تک یہاں رہے۔ اسی بنا پر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں انہیں میر سوز۔ اور سودا کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں بیان کیا ہے کہ "اگرچہ شخص جاہلی بود اما سلیقہ صحبت شعرا درہم بعرصۂ قلیل بمرتبۂ والائے شاعری رسانیدہ"

سودا کی بابت جو لطائف آزاد نے بیان کئے ہیں وہ سب لغو ہیں اور کوئی پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتا۔ کہتے ہیں لوگوں نے پوچھا بلبل مذکر ہے یا مونث تو جواب دیا کہ ایک ہو تو مرد سے عورت ہوجاتی ہے۔ یا میر جعفر زٹل اور سودا کے لطائف میں جو زبان درازی کی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔

میر ضاحک میر ضاحک کا ذکر تذکرہ میں لاتا ہرگز مناسب اور قرین انصاف نہ تھا کیونکہ وہ صرف ایک ہزلگو تھے۔ میر حسن اُن کو ہزل دوست لکھتے ہیں۔ اور انکی زندگی ہی میں جب کہ تذکرہ لکھ رہے تھے تین شعر سے زیادہ نقل نہیں کرتے اور باقی کلام کو یہ کہکر ٹال جاتے ہیں "چون گنجائش دریں بارچہ کاغذ نبود از ہزل گزشتہ بر غزل اکتفا نمود"۔ مگر آزاد کی خوش اعتقادی نے انہیں بھی ایسے ایسے کملائے فن میں شامل کردیا۔ آگے چلکر لکھتے ہیں۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ ابعد رسم عزا پرسی کے (میر حسن سے) اپنی یاوہ گوئی پر بہت عذر کئے۔ اور کہا سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگاکر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو حوصلہ و سعادتمندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں انکی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں مگر یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ اور میر ضاحک ان سے تین برس بعد مرے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکا انتقال ۱۱۹۸ھ میں ہوا۔ چنانچہ تذکرہ گار سن ڈیتاسی میں یہ واقعہ بہ تفصیل لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ آخر میں تذکرہ گلزار ابراہیمی کا حوالہ دیتے ہوئے خود بھی ضاحک کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ۱۱۹۶ھ میں زندہ و بخیریت لکھنؤ میں موجود ہیں

خواجہ میر درد آزاد لکھتے ہیں کہ ان کا خاندان بسبب پیری مریدی کے دلی میں نہایت معزز اور معظم تھا اس کی وجہ کچھ نہیں

لکھی کیونکہ میر درد کا خاندان پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور یہ آزاد کے لئے نیشتر تھا آگے چلکر لکھتے ہیں کہ سودا اور میر تقی کی غزلوں پہ جو غزلیں لکھی ہیں وہ ہرگز ان سے کم نہیں - اگرچہ خواجہ میر درد اور میر سودا وغیرہ کی ہمطرح غزلیں موجود ہیں - مگر قراین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے خواجہ صاحب کی طرحوں پر طبع آزمائی کی ہوگی - اس لئے کہ اس زمانہ میں خواجہ میر درد کو جو شہرت اور مقبولیت تھی ان دونوں کو حاصل نہ تھی یہ دونوں حضرات انکے اتباع کو اپنی سعادتمندی سمجھتے تھے - جس کا ثبوت میر کے ان الفاظ سے ملتا ہے ''بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرۂ وافی دارد - فقیر را بخدمت او بندگی خاص ہست'' حقیقت یہ ہے کہ خواجہ میر درد ایک گوشہ نشین فقیر تھے اُن کو اتنی فرصت اور اتنا دماغ کہاں تھا کہ بیٹھکر کسی کی غزلوں پر غزلیں کہیں - اب رہا یہ سوال کہ ان کی غزلیں میر و سودا کی برابر ہیں یا نہیں یہ بحث بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے - مگر مختصر یہ ہے کہ خواجہ میر درد ہی ایک ایسا شاعر ہے جس پر دور سوم کو جس قدر ناز ہو کم ہے - میر سودا اپنی جگہ پر بہت اچھے ہیں لیکن حال و قال میں بڑا فرق ہے - تصنع کی پرواز کبھی حقیقت کو نہیں پہونچتی - اور سُنے سنائے خیالات واردات کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے - یہی سبب ہے کہ میر حسن اپنے تذکرہ میں خواجہ صاحب کے دیوان کے بارہ میں لکھتے ہیں ''دیوانش اگرچہ مختصر ہست - لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب'' ایسی ہی رائے سید امداد امام صاحب اثر نے کاشف الحقائق میں انکی نسبت ظاہر کی ہے - خود آزاد کو بھی لکھنا پڑا ہے کہ ان کی غزل سات ۹ شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے - تصوف جیسا انھوں نے کہا ہے اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا -

میر تقی پر اتہام رکھتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے انہیں آدھا شاعر شمار کیا ہے'' حالانکہ میر صاحب درد کے بیحد عقیدتمند ہیں فرماتے ہیں'' جوش بہار گلستان سخن - عندلیب خوش خوان چمن ایں فن - زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شاہد دعا مصرع نوشتہ اش برصفحہ کاغذ از کاکل صبح خوشنما - طبع سخن پرداز او سرو مائل چمستان انداز ست گاہے در کوچۂ باغ تلاش بطریق گلگشت قدم رنجہ سفرباید - در چمن شعرش لفظ رنگیں چمن چمن - گلچین خیال او دگل معنی دامن دامن - شاعر زور اور ریختہ در کمال علاقگی و آراستہ'' یہ ہیں وہ الفاظ جو میر نے نکات الشعرا میں خواجہ میر درد کے لئے استعمال کئے ہیں - معلوم نہیں نصف شاعر ہونا کہاں سے اخذ کیا گیا ہے - آزاد کو خواجہ صاحب کے کلام پر غلطی کا بھی شک ہے - چنانچہ اس شعر کی نسبت بھی یہی خیال ہے -

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا

لکھتے ہیں کہ ''بتخانے کو کثرت استعمال کے سبب سے ایک لفظ تصور کیا کہ دیر کے حکم میں ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ قافیہ صحیح نہیں - اعتراض کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آتی - بتخانہ کی سند کیا دوں - لاکھوں جگہ قافیہ کی صورت میں مستعمل ہے اسیطرح انھوں نے صاحبخانہ پر بھی خط کھینچا ہے - یہاں البتہ فک اضافت کی وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ قافیہ درست نہو مگر سند میں منجملہ بہت سے اشعار کے ایک یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے -

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نکرد　　در میان خانہ گم کردیم صاحبخانہ را

آزاد آگے چلکر در پردہ ان کی درویشی اور ان کے توکل کو مصنوعی ٹھہراتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ مذمت کرتے ہیں "اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے ایسوں ایسوں جو لوگ اللہ کے نام پر توکل کرکے بیٹھ رہتے تھے ان کی سب سے اچھی گزر جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ صاحب کو نوکری یا دلی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی ہیں۔ امیر و غریب خدمت خدا کو سعادت سمجھتے تھے یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے" حالانکہ میر لکھتے ہیں "از درویشی بہرۂ وافی وارد" اور میر حسن کا بیان ہے:-

"سالک مسالک مکاشفات دینی۔ و ناہج مناہج مجاہدات یقینی از عرفائے عالیمقام و فقہائے ذوی الاحترام بر آسمان سخن مانند خورشید فرد خواجہ میر المتخلص بہ درد" خواجہ صاحب کے مکان پر جو فقرا اور اہل اللہ کا ایک بڑا جلسہ ہوتا تھا اسکی تحقیر ان الفاظ میں کرتے ہیں "ماہ بماہ ایک سعودنی جلسہ اہل تصوف کا ہوتا تھا" آگے چلکر بادشاہ کا بھی وہاں آنا بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسوقت معمولی جلسوں میں بادشاہ وقت بھی شریک ہوا کرتے ہوں۔ آزاد نے خواجہ صاحب کے ساتھ ہی خواجہ ناصر عندلیب کی بھی اسی طرح خبر لی ہے لکھتے ہیں "مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانہ اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے ان کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے ایکدن اس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اسلئے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اسوقت بچہ تھے۔ مگر ان کا تبسم اور طرز نظر دیکھکر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لیکر بیٹھنا کیا مناسب ہے خواجہ صاحب خاموش ہو رہے" اس حکایت میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس روایت کے ماخذ کا پتہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ اگر جلسہ میں کنچنیاں تھیں تو ظاہر ہے کہ جلسہ خاص ہوگا اور اسیطرح محلہ کے بے شعور بچہ کا وہاں جانا کوئی معنے نہیں رکھتا تیسرے اگر شاہ عبدالعزیز صاحب ایسے خرد سال نا سمجھ بچے تھے کہ ان کو کوئی روکنا فضول سمجھتا تھا۔ تو اس حالت میں انکی طنزیہ ہنسی کیسی۔ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ سمجھدار ہوں گے۔ اگر وہ سمجھدار تھے۔ اور اس احتراز و اعتراض کا شعور ان میں موجود تھا۔ تو وہ خود ایک ناجائز مجلس میں کیوں شریک ہوے۔ اگر وہ چلے گئے تھے اور اتفاقاً ان کو یہ جلسہ نظر آیا تو ان کا ٹھہرنا بھی کوئی معقول سبب نہیں رکھتا چوتھے یہ کہ اس زمانہ کے بچے آجکل کے بچوں کی طرح بے باک نہ تھے کہ بزرگوں کے سامنے اور بزرگ بھی وہ جو ہم محلہ ہو گستاخوں کی طرح دریدہ دہنی سے کام لیتے پانچویں یہ کہ ایک بچہ کی ہنسی کو خواجہ ناصر ایسے بزرگ کا اس قدر اہم قرار دیکر بجائے سرزنش کرنے کے اتنا مرعوب ہونا اور یہ جواب دینا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں کہاں تک قرین قیاس ہے۔ چاہیے تھا کہ بچہ کی ہنسی پر ہنس دیتے۔ یا زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیتے ——— چھٹے یہ کہ دونوں بزرگ ہم محلہ بھی نہ تھے بلکہ دونوں مکانوں میں کافی فاصلہ تھا۔ شاہ صاحب کا مکان فیروز شاہ کے کوٹلہ میں تھا اور یہ چوبچلا پہاڑی پر رہتے تھے۔ آزاد کی عادت تھی کہ وہ جس سے خفا ہوتے ہیں حتی الوسع اس کی توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ان کے یہاں (خواجہ صاحب کے یہاں) ایک صحبت خاص ہوتی تھی اس میں خواجہ میر درد صاحب ناصر عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے ایک دن مرزا رفیع سے سر راہ ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لئے فرمائش کی مرزا صاحب نے کہا کہ صاحب مجھے یہ نہیں اچھا آتا کہ سو کوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک بیدا بیٹھکر چوں چوں کرے"

اس حکایت کی تردید کے لئے غالباً آزاد ہی کی بیان کی ہوئی وہ حکایت کافی ہے جو انھوں نے میر درد کے تذکرہ میں بیان کی ہے کہ ایک شخص لکھنؤ سے دلی کو آنے لگے تو سودا سے پوچھا کہ کسی کو کوئی پیام کہنا ہو تو کہدیجئے انھوں نے جواب دیا کہ کہ میرا دلی میں کون ہے۔ ہاں اگر کبھی خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو تو سلام کہدینا۔ اس حکایت سے آزاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ درد اور سودا کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ یہاں تک کہ وہ سودا کے لکھنؤ چلے آنے پر بھی قائم رہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص غیبت میں اس قدر یاد رکھے اور مواجہ میں یہ دل آزاری روا رکھے۔ آزاد ایک اور تہمت مرزا سودا پر لگاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "مرزا موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انہیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو ان کے معمولی انداز ہیں چنانچہ اسی ضمن میں کہتے ہیں:—

درد کس کس طرح ہلاتے ہیں　　کرکے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے ساتھ ہیں　　لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں　　فخر کس چیز کا ہے انکے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیوان کی　　جمع ہر دو سے تو جیسے نقش نگیں
اسمیں بھی دیکھیے تو آخر کار　　یا تو آورد ہوا ہے یا تضمیں
اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں　　بیخ در ۔۔۔۔۔ آسمان و زمیں

اس قصیدہ کے نقل کرنے سے غرض یہ ہے کہ عام ناظرین یہ سمجھیں کہ سودا نے یہ چوٹ میر درد پہ کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قصیدہ میں درد کا سوداے ایک جگہ کے کہیں نام بھی نہیں آیا۔ یہ ایک قصیدہ ہے جسمیں عام شعرا کے حالات بتائے ہیں کہ آج کل یہ حالت ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

یعنی سودا و میر و قائم و درد　　لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں
کیا غرور و دماغ کیا نخوت　　کونسا کبر ہے جو ان میں نہیں
میر مجلس کی تاب و طاقت کیا　　کرے تکلیف شعر اُن کے تئیں
خلق کو انتظار کش کر کے　　یک دو مصرع پڑھیں جو آپ کہیں
درد کس کس طرح ملاتے ہیں　　کرکے آواز منحنی و حزیں

یہ ہے تمام حقیقت مگر آزاد نے تحریف کرکے ملاتے کو ہلاتے بنا دیا۔ جس سے بادی النظر میں گردن کا شبہ ہوتا ہے اگرچہ صراحت نہیں ہے۔ مگر در اصل شاعر کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ مصرع پڑھتے ہیں تو آواز میں کیسا کیسا درد شامل کرتے ہیں اب پوچھا جائے کہ آپ کو درد کے بیان میں اس قطعہ کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بجز اس کے کہ معمولی نگاہیں اس سے دھوکہ کھائیں افسوس کہ آزاد کو یہ یاد نہ رہا کہ سودا میر درد کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کی غزل پر غزل کہنا بھی بے ادبی سمجھتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ　　اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

یہیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ میر و سودا درد کی غزل پر غزل نہیں لکھتے تھے یا بہ قول آزاد ان کی غزل پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مندرجہ بالا قطعہ کو اگر آزاد نے واقعی درد کے حق میں سمجھا تو ان کے ذوق سخن فہمی پر ایک کافی روشنی پڑتی ہے انکی سخن سنجی کا بین ثبوت یہ بھی ہے کہ پہلے درد مرحوم کی یہ رباعی نقل کرتے ہیں۔

لے درد بہ درد جی کا کھونا معلوم　　جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

اور پھر اسپر سرقہ کا الزام قایم کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ کہ شاہ حاتم کی رباعی بھی اسی مضمون میں لاجواب ہے

ان سیم بروں کیساتھ سونا معلوم
قسمت میں لکھی ہے خاک سونا معلوم

حاتم افسوس دی داہر ذر گزشت
فردا کی رہی امید سونا معلوم

حالانکہ یہ دونوں رباعیاں سوائے ہمقافیہ وہم ردیف ہونے کے ہم مضمون کسی طرح نہیں ہوسکتیں آگے چلکر لکھتے ہیں کہ قیام الدین قایم ان کا وہ شاگرد تھا جسپر استاد کو فخر کرنا چاہیے" اگرچہ قایم کی خوشگوئی میں شبہ نہیں مگر ان کو میر درد کا خاک پا بھی سمجھنا قصور عقل اور کوتاہی فہم ہے۔

"آرگس"

(باقی)

اگر آپ خط و کتابت میں نمبر خریداری نہیں لکھتے تو جواب کی توقع بیکار ہے۔ نیجر نگار

نصر اللہ بُلڈانوی - عبد الماجد دریابادی
اور
نیاز فتحپوری

جناب نصر اللہ صاحب بی اے، بلڈانہ (صوبہ برار) کے کوئی بزرگ ہیں، جنھوں نے ہمارے محترم و فاضل دوست مولوی عبد الماجد دریابادی (مدیر سچ) کے نام ایک تحریر روانہ کی جو ۲۰ اپریل ۲۸ء کے سچ میں مع جواب کے شائع کی گئی ہے۔ بلڈانوی صاحب کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے:-

"جولائی ۱۹۲۷ء کے نگار میں دریافت کیا گیا تھا کہ خضر واقعی کوئی ہستی ہے یا نہیں، یا یونہی کسی فرضی شخصیت کو تصور کر لیا گیا ہے۔ اس کا جواب نیاز صاحب فتحپوری مدیر نگار نے یہ دیا کہ "خضر نہ کوئی بزرگ ہیں، نہ ہوئے تھے، نہ ہوں گے۔ یہ سب یہودیوں کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح لے لئے گئے"

اس کے بعد بلڈانوی صاحب حد درجہ بےچینی و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے متعدد بار نیاز صاحب سے دریافت کیا مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اس لئے میری دلی خواہش ہے کہ آپ (یعنی مولوی عبد الماجد) جیسے سید عالم کی رائے اس بارہ میں معلوم کروں تاکہ جن الجھنوں میں مبتلا ہوں، وہ دور ہو جائیں"

اس استفسار کا جواب بھی اجمال و تفصیل کے بین بین مولوی عبد الماجد صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو سوائے حصہ تمہید کے جس سے مجھے سخت اختلاف ہے اور جس کی اظہار کے لئے میں نے قلم اٹھایا ہے نہایت معقول و پسندیدہ ہے قبل اسکے کہ میں اصل مقصود پر آؤں، یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ بلڈانوی صاحب کی اول تو کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی اور اگر آئی بھی ہوتی، تو میں اس کا کیا جواب دیتا جبکہ اس سے قبل ہی اپنی رائے وجود خضر کے متعلق بالتفصیل جولائی ۲۶ء (نہ کہ جولائی ۱۹۲۷ء) کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا۔

بلڈانوی صاحب نے ایک اور غلط الزام میرے سر یہ لگایا ہے کہ "نیاز صاحب نے یہ جواب دیا کہ خضر نہ کوئی بزرگ ہیں نہ ہوئے تھے، نہ ہوں گے۔ یہ سب یہود کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح مشہور ہو گئے"

حالانکہ میں نے جو کچھ جولائی ۲۶ء کے نگار میں اس مسئلہ کے متعلق لکھا تھا وہ صرف ان مطالب پر حاوی تھا کہ:-

"خضر کے متعلق جو روایات عوام میں مشہور ہیں وہ قابل وثوق نہیں ہیں اور جن

احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ملاقات اُن کے سفر مدین کے وقت ضرور ایک ایسے انسان سے ہوئی جو اس نواح کا جاننے والا تھا اور جس نے موسیٰ کی رہبری کی، لیکن یہ ایک واقعہ تھا جو اسی وقت ختم ہو گیا اور نہ اب اُس شخص کا وجود باقی ہے اور نہ وہ صحرا نوردوں کی دستگیری پر مامور۔ اگر سبز پوش ہونے یا اسی طرح کسی اور ظاہری سبب کے بنا پر اُس کو خضر کہا جاتا ہے تو یہ اس کا اصلی نام نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس نام کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اور تمام خلاف عقل باتوں کا ظہور اس سے منسوب نہ کیا جائے۔"

میں نے نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ ہر چند خضر کی نبوت میں اختلاف ہے، لیکن اگر ان کو نبی مان لیا جائے تو بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

یقین ہے کہ میرے اس بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ میں نے خضر کے متعلق کیا لکھا تھا اور نصر اللہ صاحب نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اب اس کے بعد میں مولوی عبدالماجد صاحب کے جواب کے اُس حصہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے اختلاف ہے اور ہر چند اس کا تعلق مسئلۂ وجود خضر سے تو نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے کہ وہ نہایت ہی مہلک اصول استبداد کی حمایت میں لکھا گیا ہے اس کی مخالفت ضروری خیال کرتا ہوں۔

مدیر سچ نے اپنے جواب کی ابتداء یوں کی ہے:۔

"مکتوب بالا میں جس رسالہ نگار کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ میری نظر سے نہیں گزرتا، اسلئے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کیا لکھا گیا اور کیا دلائل پیش کئے گئے ہیں، لیکن رسالہ مذکور کی "جدت و اجتہاد" کی پہلی مثال میرے علم میں نہیں آئی ہے۔ مسائل دین میں اس کی "تحقیق و اجتہاد" سے متعلق پیشتر بھی بعض مراسلے دفتر سچ میں موصول ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس باب میں کچھ قصور جواب چھپوانے کا ہے تو سوال کرنے والا بھی اس سے کم مجرم نہیں ـــــ آپ کا کوئی عزیز قریب اگر خدا نخواستہ علیل ہے اور آپ .... بجائے کسی طبیب حاذق کے مطب کی جانب رخ کرنے کے شہر کے ایک کامیاب وکیل کے دفتر میں قدم رکھتے ہیں ....

اور وہ بیرسٹر وکیل صاحب بجائے آپ کو کسی طبیب کے پاس جانے کی ہدایت کرنیکے اگر خود اپنی اٹکل اور ذہانت سے بعض دواؤں کے نام سنا دیں اور وہ نسخہ بے اثر یا مضر ثابت ہو تو اس افسوسناک نتیجہ میں خطا تنہا ان وکیل صاحب ہی کی ہوگی یا کچھ

ذمہ داری آپ پر بھی عاید ہوتی ہے، پھر یہ کیا قیامت ہے کہ جوش و ولولہ تو آپ کو مسایل دین کی تحقیق کا ہوتا ہے اور رجوع آپ "ادب لطیف" اور "افسانہ نگاری" کے "رئیس التحریر" سے کرنے لگتے ہیں ———— اس سے بڑھکر ستم ظریفی یہ ہے کہ مدیر سچ کو بکمال فیاضی جید عالم کی سند عطا فرماکر اس سے اپنی تشفی چاہی جاتی ہے، اگر میرا شمار کسی اعتبار سے اور کسی معنے میں بھی جید عالموں میں ہو سکتا ہے تو عامی اور مسائل دین سے جاہل کا اطلاق ہندوستان بھر میں شاید کسی پر بھی نہ ہو سکے، اس قحط الرجال میں بھی خدا کے فضل سے دہلی، یوپی، بہار، حیدرآباد، ہندوستان کا کوئی ٹکڑا مستند و جید علماء سے خالی نہیں ہے، حیرت ہے کہ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو چھوڑ کر روشنی کی طلب ریگ کے ذروں سے کیجاتی ہے ....

....

بہرحال اگر تشفی و تحقیق مدنظر ہے تو کسی مستند عالم دین ہی کی جانب رجوع کرنا چاہئے البتہ اگر ایک عامی کی سطحی واقفیت و معلومات ہی کا امتحان لینا مقصود ہے تو عرض ہے کہ:— (اس کے بعد اصل جواب شروع ہوجاتا ہے)

میں اس تمہید کے ان اجزاء سے بحث نہیں کرونگا، جن میں مدیر سچ نے اپنے آپ کو از راہ عجز و انکسار یا برنبائے رسم و رواج ایک ناواقف و عامی شخص ظاہر کرتے ہوئے، سایل کو اوّل اوّل کسی "مستند عالم دین" کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے اور پھر اس خیال سے کہ کہیں ان کی معلومات کا امتحان لیا جانا مقصود نہ ہو، ایک عالمانہ جواب دینے کو بھی سعی فرمائی ہے، کیونکہ کبھی کبھی میں نے بھی اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں اپنی بے مائگی و کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے سوالات کا جواب دیا ہے اور ہر وہ شخص جو نفسیاتی اصول سے واقف ہے، اس نوع کے فقروں کا استعمال کیا کرتا ہے حالانکہ ان کا مفہوم وہ نہیں ہوا کرتا جو الفاظ سے متبادر ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر میں نے وکیل ہوکر طبیب کی خدمت انجام دینے اور ادب لطیف و افسانہ نگاری کا رئیس التحریر ہوکر تحقیق مسائل دین کی ناروا جسارت کی تھی، تو بالکل وہی الزام بلکہ اس سے زیادہ مولوی عبدالماجد صاحب پر عاید ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے عامی و جاہل ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد عالمانہ رنگ کا جواب دینے کی سعی فرمائی اور میں نے جواب دینے سے قبل "غرور نما عجز" کی صورت سے بھی اپنے جہل و عدم علم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر مدیر سچ خود بغیر کوئی جواب دئے ہوئے سائل کو ان علماء کی طرف (جن کو وہ جواب دینے کا اہل سمجھتے ہیں) رہنمائی کرکے خاموش ہوجاتے تو بیشک ان کا مجھے ملامت کرنا جائز ہو سکتا تھا، لیکن جب خود اُنھوں نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو میرے حق میں اُنھیں قابل اعتراض نظر آتا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "مدعی منکر مے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن" کیا معنے رکھتا ہے — سوائے اس کے کہ — مدیر سچ کا مقصود یہ ہو کسی مسئلہ

دینی میں رائے دینے کا حق بہ نسبت مدیر نگار کے ان کو زیادہ حاصل ہے کیونکہ ادھر خلافت کمیٹی کا صدر ہونے کی حیثیت سے انھیں قدرت کی طرف سے مسائل دینی کے سمجھنے کی بھی سند مل چکی ہے اور "ادب لطیف اور افسانہ نگاری" کا ذوق رکھنے والے شخص کے حق میں صم بکم عمی فہم لایفقہون کی نص قطعی موجود ہی ہے۔

اگر عالم دین ہونے کے لئے ریش دراز و بروت کوتاہ کی شرط ضروری ہے، اگر مسائل مذہب سمجھنے کے لئے طویل جبہ و شملہ ناگزیر ہے، اگر تفقہ فی الدین کا حق اتنا ہی زیادہ ایک شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جتنا زیادہ "عبوسا قمطریرا" ہو، تو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان میں سے کسی شرط کا حامل نہیں ہوں، اور مجھ سے زیادہ ناواقف دین، بلکہ نامسلم اور کوئی نہیں ہو سکتا، لیکن اگر قرآن میں "تفکر و تدبر" کا حکم عام ہے جس میں عرب و عجم، شرق و غرب، وضع و صورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، تو پھر مدیر سچ معاف فرمائیں، اگر میں یہ کہوں کہ دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے کی اہلیت مجھ میں بھی انھیں کی طرح موجود ہے، البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ میں نے اپنی صورت بگاڑ کر اپنے آپ کو مولانا کہلوانا پسند نہیں کیا، ورنہ یہ چنداں دشوار نہ تھا جبکہ ہر مسجد کا موذن و امام باوجود انتہائی جہل کے نہایت آسانی سے مولانا بنجاتا ہے۔

اب رہا سوال اُس ظاہری و کتابی علم کا، جو ممکن ہے کہ مدیر سچ کے نزدیک کوئی بڑی اہمیت رکھتا ہو، سو اس لحاظ سے بھی مدیر نگار ایک سے زائد اسناد اپنے پاس رکھتا ہے، اور جن کتابوں کے سمجھنے کی اہمیت مولانا عبدالماجد دریابادی یا ہند کے اور کسی "علام اللوذعی" میں پائی جاسکتی ہے، ان کو بحمداللہ مسٹر نیاز فتحپوری بھی سمجھ سکتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ متقدمین کو خدا اور ان کی کتابوں کو صحائف آسمانی سمجھتے ہیں اور یہ ان کو ایک انسان ——— سمجھکر ان کی تحقیق کو "آخری لفظ" قرار نہیں دیتا۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان کی بہترین صفت تقلید و اتباع ہے اور اس کا مسلک یہ ہے کہ دیگر حیوانات سے انسان کو ممتاز بنانے والی صفت صرف اُس کی قوت اجتہاد و ابداع ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نام ہے ابوحنیفہ یا مالک و حنبل کی تحقیقات پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے کا اور اس کے نزدیک وہ شخص مسلمان ہی نہیں جس نے خود اپنے اندر کوئی اجتہادی قوتِ فکر پیدا نہیں کی ان کا اعتقاد یہ ہے کہ انسان کی پیداوار صرف رازی و شبلی کے وقت تک ہو کر بند ہو گئی اور اس کا خیال یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض پیدا ہونے کی استعداد جس قدر اب پائی جاتی ہے، پہلے نہیں تھی، وہ ہیں کہ اسلام کی جستجو صرف بخاری و مسلم میں کرنی چاہتے ہیں کیونکہ قرآن کا سمجھنا ان کے سمجھنے پر منحصر ہے اور یہ معتقد ہے کہ قرآن کا علم صرف قرآن ہی سے ہو سکتا ہے اور اس کے سمجھنے کا ہر وہ شخص مدعی ہو سکتا ہے جو غور و فکر سے کام لے، اگر مذہب کی ہیئت اجتماعی، انفرادی یقین سے مرتب ہوتی ہے، یعنی اگر مذہب کی صحیح بنیاد انفرادی اعتقاد پر قائم ہوتی ہے، تو دنیا کا بڑے سے بڑا انسان بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی کو اپنے مزعومات کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ لا اکراہ فی الدین سے مقصود یہی نہیں ہے کہ مذہب کے باب میں تیغ و تفنگ کا استعمال ناجائز قرار دیا جائے بلکہ اس سے مدعا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی خاص اعتقاد و یقین پر قائم رہنے کے بعد ہی اس منزل تک پہونچ سکتا ہے جو فطری دین کا مقصود ہے، تو کسی کو تعرض کا حق حاصل نہیں ہے۔

جہاں تک خالص تحقیق و تفتیش کا تعلق ہے، جس حد تک ایمان و اعتقاد کے تحفظ کے لیے جستجوئے انسانی وسیع ہو سکتی ہے، اس حد تک نہ بخاری و مسلم کی تحقیق سند ہو سکتی ہے اور نہ بیہقی و رازی کے دلائل سند آ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہر شخص کا ایمان یعنی اس کے قلب کا سکون بالکل جدا چیز ہے اور وہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب خود ہی اس کے قلب کے اندر یہ کیفیت طمانیت پیدا ہو جائے۔ پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بڑے بڑے حکما و عقلا، کے اقوال و نصایح، براہین و دلائل یہ کیفیت پیدا نہ کر سکے اور دفعتہً حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ایک ایسی چیز سے جو حقیقت کے لحاظ سے لاشئی محض تھی۔ میں نے سنا ہے کہ خود عبدالماجد صاحب دریا بادی کو جس چیز نے فلسفہ کی گمراہی سے ہٹایا وہ خواجہ حسن نظامی کا ایک مضمون "قرام قبلہ و شملہ" تھا۔

اس لئے آج کل میرے نزدیک کسی شخص کو تلقین ایمان کرنے کے لئے یا اس کے اخلاق درست کرنے کے لیے متقدمین کے دلائل کا دفتر بے پایاں لیکر بیٹھ جانا، یا خلاف عقل باتوں کو صرف اس طرح باور کرنا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے یا فلاں بزرگ نے اس طرح لکھا ہے" ایک ایسی بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ تباہ کن چیز اسلام کے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ عقلی بے برگ و باریاں اور ذہنی بے مائگیاں، اسی طریق کار کی غارتگری کا نتیجہ ہیں اسلام ہو یا کوئی اور خدائی مذہب اس کی صداقت کی بہترین دلیل یہ نہیں ہے کہ اس کے مسائل و تعلیمات کو شجر ممنوع قرار دیدیا جائے اور ایک مفکر و مدبر کو یہ کہکر رو کر دیا جائے کہ ہر شخص کی عقل اس کے کنہ تک نہیں پہونچ سکتی، کیونکہ اس صورت میں اسکے معنے یہ ہوں گے کہ وہ مذہب صرف متقدمین کا ہے اور انھیں کی عقل کو معیار قرار دیکر اس کے مسائل منضبط کئے گئے ہیں یا پھر یہ مراد ہو گی کہ اب ساری دنیا بیوقوفوں سے بھر گئی ہے اور کسی دماغ میں یہ اہلیت باقی نہیں کہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مدیر سچ یا اور کوئی مدعی علم و فضل اگر کسی حدیث یا آیت قرآنی کو استدلال میں پیش کر کے اس کا مفہوم لوگوں کو بتائے تو اس میں چون و چرا کی گنجایش نہ ہو، لیکن نیاز فتحپوری اگر دعویٰ کرے کہ وہ بھی انھیں کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی قوت رکھتا ہے تو اس پر مضحکہ اڑا دیا جائے محض اس لئے کہ ایک نے وعظ و تلقین کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور دوسرا اس قسم کی تجارت کو پسند نہیں کرتا۔

مدیر سچ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا قرآن ہندوؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص تھا اور دوسرے لوگ اسے چھو بھی نہیں سکتے تھے اس پر غور کرنے کی دعوت ہر کہ و مہ کو دی گئی ہے اور ہر وہ شخص جو تفکر و تدبر کر سکتا ہے، خواہ وہ کسی زمانہ میں ہو قرآن کے سمجھنے کا اہل ہے پھر اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہئے کہ عقول انسانی کے لئے یہ زمانہ ایسی زبردست ترقی کا آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر اس کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف معقولات، لیکن معقولات بھی صدرہ، شمس بازغہ، شرح چغمنی اور ہدیہ سعیدیہ کے قسم کے نہیں جن میں سوائے مغالطات کے اور کچھ نہیں ہے، بلکہ وہ جو فطرت نے ہر صحیح دماغ انسانی میں ودیعت کئے ہیں اور جن کے استعمال کا ہر شخص کو فطری حق حاصل ہے

اسلام کو اگر آپ فطری مذہب سمجھتے ہیں تو اصول فطرت ہی کے مطابق اس کو سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نہ کیجئے۔ اگر ایک شخص کلام مجید کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے خضر کی زندگی دوام لایعنی سی بات ہے۔ موسیٰ کا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی ہے، یونس کا دہان ماہی کے اندر چلا جانا خلاف حقیقت ہے یوسف کا معجزۂ حسن وجمال صرف ایک افسانہ ہے، تو کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اُسے دائرہ اسلام سے خارج کردے کیونکہ وہ قرآن کی صحت کا منکر نہیں ہے، بلکہ قرآن پر غور کرنیکے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے اور اسی صورت سے وہ قرآن کو الہامی کتاب مان سکتا ہے۔ اگر آپ نے اسپر الزام لگایا کہ وہ قرآن نہیں سمجھتا تو وہ بھی آپ پر یہی الزام قائم کرسکتا ہے۔ اس کے بعد آپ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ اپنی حمایت میں ایک انبار متقدمین کی کتابوں کا سامنے لاکر ڈالدیں، لیکن اسکا نتیجہ یہ ہوگا وہ ان سب کو ناقابل اعتبار کہدیگا یا پھر سرے سے قرآن ہی کی اہمیت وصداقت کا منکر ہو جائیگا

ہر ترقی کرنے والے مذہب کی جان وسعت نظر وخیال ہے، یعنی جب تک اس کی آغوش وسیع نہ ہوگی ترقی ممکن نہیں۔ اور اس کے آغوش کی وسعت یہی ہے کہ وہ شروط مذہب کو آسان اور پابندیوں کو کم کیا جائے، نام ومقام وضع ولباس، معاشرت ومعیشت وغیرہ سب سے بے نیاز ہوکر اسلام کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ گنگا دھر، جوزف، شاپور جی اور ہرمزد اپنے اصلی ناموں اور اپنے خاندانی وضع لباس، حالت وصورت کے ساتھ بھی مسلمان شمار کیئے جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور آخر کار یہ تنگ نظری ناقوس واذان کی نزاع تک پہونچ جاتی ہے، حالانکہ ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس، کلیسا کے گھنٹے کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا وہ اذان کو سمجھتا ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو خود ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے جب اذان وناقوس کا مقصود بالکل ایک ہی جب ان دونوں سے مراد نمازیوں یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نزاع ومجادلہ کیسا؟ کیا اگر کسی منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستے گئے ہیں تو ان راستوں کے چلنے والوں کو باہم لڑنا چاہئے کیا ہر ایک کو اپنی منزل صرف اس جھگڑے میں کھوئی گم کرنا چاہئے، "کہ ہمارا راستہ صحیح ہے اور تمہارا غلط"

مسلمانوں میں اس تنگ نظری پیدا کرنے کی ذمہ داری خواہ وہ ہند میں ہوں یا بیرون ہند، صرف گروہ علما پر عاید ہوتی ہے اور مذہب وقوم کی جملہ خرابیوں کا سرچشمہ انھیں کے جامد اور خودغرض دماغ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل، مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنی منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف ان کی ذات کو قرار دیا جائے تو پھر معیار کفر ونامسلمانی قائم کرنے کے لئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ بہشت ودوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں ہیں، کسی کو مسلمان قائم رکھنا یا کافر بنا دینا ان کے اقتدار میں ہے، مذہب اسلام ایک راز ہے جس کے امین صرف وہی ہیں اور دنیائے اسلام کا فرض ہے کہ ان کے مواعظ کے سامنے خواہ وہ کتنی ہی دور از عقل باتوں سے کیوں نہ لبریز ہوں سر بسجود ہو جائے کیا اس دور جمہوریت وآزادی میں اس عہد حریت فکر ورائے میں بھی یہ مدعیان اس استبداد کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ وہ تو ایک امر پر اظہار رائے کریں اور میرا منہ بند کردیں شاید یہ اثر ہے اس ہلکی سی

مولویت کا جو جمعیۃ العلماء کے ممبر ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل ہوگئی ہے بہرحال وہ اپنی جگہ اپنے آپ کو کچھ ہی نہ سمجھیں اور مذہب کا مخصوص یونیفارم رکھنے والوں کے متعلق وہ کیسی ہی رائے کیوں نہ رکھتے ہوں، لیکن کم از کم میں ان بتوں کی پرستش کے لئے طیار نہیں اور میرا ایمان و یقین ہے کہ جب تک پوری قوت کے ساتھ ان کو مسمار نہ کیا جائے گا اس وقت تک کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

افغانستان، ترکی کی ترقی کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس جماعت کے افراد کو گردن پکڑ کے باہر نکالا گیا اور ان کے جھوٹے علم و تقدس کے چہرے سے نقاب نوچ کر دنیا کو بتایا گیا کہ ان کا باطن کس قدر سیاہ اور ان کے اخلاق کس درجہ مکروہ ہیں

نیاز

نادرات

موت اور فقر دو بڑی مصیبتیں ہیں، لیکن موت ان میں زیادہ آسان ہے۔

قرابت محبت کی محتاج ہے اور محبت قرابت سے مستغنی

اس شخص کو، جو اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اس حال میں کہ وہ حسین ملبوس میں آراستہ ہے، یا تو فیلسوف ہو جانا چاہئے یا بیوقوف

مرد ایسی عورت سے محبت نہیں کرتا جسے اس کو درس دینا پڑے بلکہ وہ اس عورت سے محبت کرتا ہے جو خود اسے درس دے

حسین چہرہ کا نظارہ دل میں امیدیں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا کا کوئی احساس اتنا مغرور نہیں، جتنا عورت کا وہ احساس جب وہ اول اول ماں بننے کو ہوتی ہے۔

دنیا میں اس سے زیادہ لذت کسی چیز میں نہیں ہے کہ انسان محبوب ہو۔

آدمی کو چاہئے کہ اپنی صورت آئینہ میں دیکھے، اگر وہ حسین ہے تو غور کرنا چاہئے کہ اس میں کسی قبیح بات کو شامل کرنا کس قدر بڑی بات ہے اور اگر قبیح ہے تو اس میں کسی اور قبیح کا اضافہ کرنا اور زیادہ قبیح ہے۔

وہ شخص جو وطن کی خیانت کرتا ہے ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کا مال چوروں کو کھلا رہا ہے، حالانکہ اس کی اجازت نہ باپ دیتا ہے اور نہ یہ مال چوروں کو مطمئن کر سکتا ہے۔

کوئی حکومت بغیر افراد کے نہیں ہوتی۔ اچھے افراد بغیر مال کے بیکار ہیں، مال نہیں ملتا مگر انصاف سے اور انصاف نہیں ہوتا مگر علم سے، اس لئے حکومت کی بنیاد علم ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوت کو غرور ضعیف کر دیتا ہے اور ضعیف کو کوشش قوی بنا دیتی ہے۔

مومن اپنے گناہ کو اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ ایک پہاڑ ہے جو خدا جانے کس وقت اسپر گر جائے اور ایک فاجر کے نزدیک معصیت گویا ایک مکھی ہے جو ناک پر سے گزر گئی۔

حسین عورت ایک قیمتی جوہر ہے اور اس کی حسین فطرت ایک بڑا خزانہ ہے۔

باب الاستفسار

قارون اور اُسکی دولت

(سید علی احمد صاحب زبیری - جلگاؤں)

جس طرح یوسف کا حسن ضرب المثل ہے، اسی طرح قارون کی دولت بھی بہت مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ اُسکے خزانہ کی کنجیاں خدا جانے کتنے گدھوں پر لادی جاتی تھیں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی بددعا سے مع اپنے تمام خزانہ کے زمین میں دھنس گیا اور برابر قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔ جس طرح آپ نے حسن یوسفی کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، اسی طرح براہ کرم قارون کے متعلق بھی کچھ لکھئے۔

(نگار) قارون کا قصہ ابن خلدون نے تو لکھا نہیں لیکن ابن اثیر جزری نے مختلف روایات کو ملا کر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

قارون بن یصہر بن قاہث حضرت موسیٰ کا عم زاد بھائی تھا اور اس قدر دولت مند تھا کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں، نشۂ دولت سے سرشار ہو کر جب اُس نے لوگوں کو ستانا شروع کیا تو اس کو لوگوں نے سمجھایا لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور کہا کہ اگر خدا مجھ سے راضی نہ ہوتا تو اتنی دولت کیوں دیتا۔ جب موسیٰ نے اُس کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا تو اس نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے کہا کہ اب موسیٰ تم لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کوئی تدبیر اس کو زک دینے کی سوچنا چاہیئے۔ اور آخر کار ایک عورت اس امر پر راضی کی گئی کہ وہ موسیٰ پر زنا کی تہمت رکھے، لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور موسیٰ کو سارا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بدعا کی اور وہ زمین میں دھنس گیا۔ اور اب بھی برابر دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اس قصہ میں غور طلب امر صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ خزانہ کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ زمین میں دھنس گیا اور دھنستا چلا جا رہا ہے۔ قرآن پاک میں قارون کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ المومن میں، سورۃ العنکبوت اور سورۃ القصص میں، سورۃ المومن میں صرف اس قدر ذکر ہے:۔

ولقد ارسلنا موسیٰ بآیتنا وسلطان مبین۔ الی فرعون وہامان وقارون فقالوا سحر کذاب	تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور کھلی ہوئی سند لیکر، فرعون ہامان اور قارون کی طرف اور انھوں نے اس کو جھوٹا جادوگر کہکر پکارا

اس آیت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی تکذیب کرنے والوں میں فرعون ہامان کی طرح قارون بھی بہت اہم اور قابل

ذکر ہستی تھا۔

سورۃ العنکبوت میں قارون کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :۔

وقارون وفرعون وہامان۔ ولقد جاءہم موسیٰ بالبینات فاستکبروا فی الارض وما کانوا سابقین۔ فکلا اخذنا بذنبہ، فمنہم من ارسلنا علیہ حاصبا ومنہم من اخذتہ الصیحۃ ومنہم من خسفنا بہ الارض و منہم من اغرقنا وما کان اللہ لیظلمہم ولاکن کانوا انفسہم یظلمون۔

(اور ہم نے تباہ کیا) قارون، فرعون اور ہامان کو اور تحقیق موسیٰ نشانیاں لیکر آئے لیکن انھوں نے زمین میں غرور کیا اور ہم سے بازی نہ لیگئے۔ پس ہم نے ہر ایک کے گناہ کا مواخذہ کیا، پھر انہیں میں سے ایک پر طوفان بھیجا، کسی کو زلزلہ نے پکڑا کوئی زمین میں دھنس گیا اور کسی کو ہم نے غرق کیا۔

اس سورت میں بھی قارون کا ذکر فرعون وہامان کیساتھ آیا ہے لیکن یہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قارون کی ہلاکت کا ذریعہ کیا ہوا۔ زمین میں دھنس جانے کا ذکر قارون ہی کی موت کی طرف اشارہ ہے۔

سورۃ القصص میں قارون کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، مسئلہ زیر بحث کے متعلق جسقدر حصہ ہے اسے نقل کرتے ہیں

ان قارون کان من قوم موسیٰ فبغیٰ علیہم وآتینٰہ مع الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین۔

. . . .

. . . .

فخسفنا بہ وبدارہ الارض۔ فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر۔ لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پس اس نے بغاوت کی اور ہم نے دیئے تھے اس کو خزانے یہاں تک کہ اس کی دولت ایک قوت والی جماعت سے بھی نہ اُٹھ سکتی، جب اس کی قوم والوں نے اُس سے کہا کہ اترا و مت اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پس دھنسا دیا ہم نے اس کو اور اسکے گھر کو زمین میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ہو سکا اور نہ وہ خود اپنی مدد کر سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کی تمنا کرتے تھے کہنے لگے، اللہ جسکو چاہتا ہے اس کے رزق میں وسعت پیدا کر دیتا ہے اگر وہ ہم پر مہربان نہ ہوتا تو ہمیں بھی تباہ کر دیتا۔

کلام مجید میں جہاں اس کے خزانہ کا ذکر آیا ہے وہاں لفظ، مفاتح بھی موجود ہے اور اسی سے لوگوں کا خیال خزانہ کی کنجیوں کی طرف گیا ہے، حالانکہ مفاتح، جس طرح جمع ہے، مفتاح (کنجی) کی اسی طرح وہ مَفتَح (خزانہ) کی بھی جمع ہے اور کلام مجید میں مفاتح کا لفظ مفتح (خزانہ) ہی کی جمع کی صورت میں آیا ہے، جس کا ثبوت اس کی ضمیر سے بھی ملتا ہے جو واحد ہے اور جس کا مرجع قارون ہے، اگر مفاتح سے مراد کنجیاں ہوتیں تو اس کے بعد ضمیر جمع کی آتی کیونکہ اُس کا مرجع کنوز ہوتا جو جمع ہے۔ اس لئے کنجیوں کا مسئلہ تو طے ہو گیا۔ اب رہا زمین میں دھنسنے کا واقعہ سو کلام مجید میں صراحۃً اس کا ذکر موجود ہے۔ مکانوں کا دھنس جانا خاص کر ایسی صورت میں جبکہ نیچے تہ خانے ہوں، بارہا دیکھنے میں آیا ہے اس لئے ایسا تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی

عقلی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم "محو کر دینا یا تباہ کر دینا" ظاہر کیا ہے جو باعتبار نتیجہ کے تو غلط نہیں ہے لیکن بہ لحاظ واقعہ ضرور نادرست ہے۔ اس امر کی تصدیق کہ قارون زمین کے بیٹھ جانے سے معہ اپنے مکان کے خاک میں دفن ہو گیا۔ سورۂ عنکبوت کی ان آیتوں سے بھی ملتا ہے، جن کو ہم نے یہاں نقل کیا ہے۔ ان آیات میں قارون، فرعون، ہامان کا ذکر کر کے ہر ایک کی تباہی کی نوعیت کا ذکر علحدہ علحدہ کیا ہے، چنانچہ فرعون کا غرقِ آب اور قارون کا پیوندِ خاک ہونا وہاں بھی صراحۃً مذکور ہے،

اب رہا یہ امر کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ زمین پر میں تجھے اختیار دیتا ہوں اور یہ اختیار پانے کے بعد موسیٰ نے زمین سے کہا کہ قارون کو پکڑ لے، پھر قارون کا معافی طلب کرنا، موسیٰ کا نہ ماننا اور خدا کا کہنا کہ اگر قارون مجھ سے معافی طلب کرتا تو میں دیدیتا، یا یہ کہ قارون کا قیامت تک زمین کے اندر دھنستا چلا جانا، یہ سب حکایاتِ یہود کے ٹکڑے ہیں جن کو ہمارے ہاں کے مفسرین بغیر نقد و جرح کے لے لیا کرتے ہیں اور جو پیشہ ور مولویوں اور واعظوں کے ذریعہ سے عوام تک پہونچتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ کلام مجید سے ان بے سر و پا باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

نیاز

زنانِ بازاری

کی پر اسرار زندگی کے متعلق چھ عجیب و غریب ناول

سعید ۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک پاتر کے جذبات کا بہترین خاکہ انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے قیمت .... عمر

شاہدِ رعنا ۔ دہلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری کمسنی سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب لطف پیدا کرتی ہے قیمت .... عمر

انجامِ عیش ۔ بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اس قدر تکمیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے۔ سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۱ار

سعادت ۔ دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب انداز سے بیان کیا گیا ہے قیمت ۸ر

سرائے عیش ۔ فلسفہ حسن و عشق اور تفریحات خاصہ پر عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس میں ایک شریف گھر اور ایک طوائف کے دن رات کا تمام تر تبدل کا فرق دکھایا گیا ہے قیمت ۱۰ر

سراب عیش ۔ طوائف سے نکاح کر کے ان کو بہو بیٹیوں میں لاکر رکھنے کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۰ر

مینیجر "نگار" بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

پنکھڑیاں

بچوں کی معصوم دنیا میں

نندیا پور

دور، بہت ہی دور، یہاں سے
اور اس سے بھی دور
ندی اک نکلی ہے جہاں سے
اور اس سے بھی دور
دلدل ہے گہری سی جہاں پر
دلدل سے بھی دور
جنگل میں ہے بڑھیا کا گھر
جنگل سے بھی دور
یاد ہے اس کو ایک کہانی
ہے اس میں اک حور
حور یہ ہے اک ملک کی رانی
ملک ہے نندیا پور
اس جنگل کو دیکھوں گا میں
جنگل سے بھی دور
حور کے ملک میں جاؤنگا میں
یعنی نندیا پور

کنکوا بن جاؤں

تارہ سا لہراؤں
کنکوا بن جاؤں

جب اماں تم آؤ
چھت کو خالی پاؤ
چپ کی چپ رہ جاؤ
سارے میں ڈھنڈواؤ

پھر بھی میں تو نہ آؤں
کنکوا بن جاؤں

ڈور کو جب تم پاؤ
کھینچو اور کھنچواؤ
اور ہنستی بھی جاؤ
اور پھر مجھکو بلاؤ

تب میں گھر میں آؤں
کنکوا بن جاؤں

حامد اللہ افسر

عروسِ سحر

بہار سبزہ زار میں — نشاطِ میگسار میں
ہجوم برگ و بار میں — غنائے آبشار میں
سرور میں خمار میں — خیال کیف بار میں
فضائے کوہسار میں — گلوں کی ہر قطار میں
ضیائے مستعار میں — قلوبِ داغدار میں
چمک تھی ایک نور کی
حریفِ برقِ طور کی

حسین عاشقِ سحر — یکایک آ گئی نظر
رباب ہاتھ میں لئے — خموشیوں کی پردہ در
تغنّنِ لطیف سے — تھی ہوشیار و باخبر
نمودِ حسن میں نہاں — فروغِ برقِ فتنہ گر
غرور تمکنت سے تھی — شباب سے نڈر مگر
تکلم شباب تھی
تبسم حجاب تھی

شعاع تھی وہ نور کی — کہ داستاں غرور کی
تجلیاں تھیں ہر طرف — "عروسِ ناصبور" کی
وہ نکہتِ گلاب میں — شمیم زلفِ حور کی
نسیم خوش خرام میں — خبر تھی دور دور کی
مچل رہی تھیں لذتیں — سرور میں سرور کی
شباب پر بہار تھی
کہ چشم میگسار تھی

وہ زلفِ پر غرور تھی — کہ دامگاہِ سوز تھی
جبین تھی وہ عرق عرق — کہ صبح ناصبور تھی
وہ چشمِ وحشت آشنا — کہ پیکِ نزد و دور تھی
وہ غمزِ فروش تھی ادا — کہ مژدۂ سرور تھی
وہ سادگی لباس میں — کہ فطرتِ غیور تھی
شباب بے نقاب تھا
نقاب میں شباب تھا

وہ مستئ بہار تھی — کہ لغزشِ خمار تھی
گلوں پہ بلبلِ چمن — نظیرِ بادہ خوار تھی
شفق کی "سرخیٔ نمو" — امینِ لالہ زار تھی
چمن کی سر دو تر ہوا — محیط و کیف بار تھی
وہ صبح کی گھڑی تھی کب — "عروس تاجدار" تھی
پیامِ زندگی تھی وہ
کہ نورِ سرمدی تھی وہ

وہ خال کفر دل ربا — کہ نقطۂ خدا نما
وہ بادہ ریز آنکھیں تھیں — کہ بجلیاں تھیں برملا
وہ عارض صبیح تھے — کہ وجہ جوشِ مدعا
وہ گلفروش لب تھے یا — کہ مرکز نشاط زا
وہ تنگنائیِ دہن — کہ بابِ گوہر صفا
وہ گردن بلور تھی
کہ منبعِ غرور تھی

وہ خندۂ ارم نما　　وہ جلوۂ صنم نما
وہ نازِ مستیِ نظر　　وہ غمزۂ عدم نما
وہ جوشش ادا طلب　　وہ عشوۂ الم نما
وہ فتنۂ سبکروی　　وہ جادۂ ستم نما
وہ تمکنت شباب کی　　وہ ظلم بھی کرم نما
وہ شورشِ خموش تھی
مگر نمودِ دوش تھی

وہ گرم جوشیِ جہاں　　وہ رنگ و بوئے گلستاں
وہ نغمہائے شوق تھے　　کہ حسن کی تھی داستاں
تڑپ وہ انگلیوں میں تھی　　چمک رہی تھیں بجلیاں
ابل رہی تھی کیفیت　　مچل رہی تھیں مستیاں
وہ آہوئے رمیدہ تھی　　کہ حسن سے تھی بدگماں
ہزار پردہ پوش تھی
مگر ادا فروش تھی

بہار عمر دوش تھی　　خمارِ کیف ہوش تھی
قدم میں لغزشیں بھی تھیں　　اگرچہ بادہ نوش تھی
ربابِ حسنِ صوت سے　　اسیرِ جذب جوش تھی
تلاطمِ حیات میں　　وہ فتنۂ خموش تھی
مگر فراق و ہجر سے　　وہ درد و غم فروش تھی
وہ حسن پُر بہار تھی
سعید و کامگار تھی

عروس بے رفیق تھی　　انیس درد و ضیق تھی
محیطِ بحرِ لطف میں　　شناور و غریق تھی
شکستگیِ دل کی وہ　　انیس تھی شفیق تھی
ہجوم لالہ زار میں　　وہ پیکرِ عقیق تھی
مگر نگاہ غور میں　　وہ نکتۂ دقیق تھی
صبوحیوں کی لہر میں
عیاں ہوئی تھی دہر میں

جو گا کے کچھ ٹھہر گئی　　تو لذتِ سحر گئی
اٹھی کسک سی دل میں پھر　　چمک کے تا جگر گئی
کچھ اشکِ سرخ بہہ چلے　　شفق پہ جب نظر گئی
وہ زلفِ عنبریں غضب　　بکھر کے تا کمر گئی
وہ تھر تھرا کے گر پڑی　　کہ جان سے گزر گئی
وہ دورِ عیش مٹ گیا
کہ وقت ہی پلٹ گیا

یہ انقلابِ دہر ہے　　کہ صد بلائے قہر ہے
حیات کی ہر کشمکش　　کہ بحرِ غم کی لہر ہے
ثبات کی بھی چاشنی　　اثر میں خاص زہر ہے
تباہ بھی وہ ہو گیا　　بسا جو آج شہر ہے
وجودِ حافظِ حزیں　　حبابِ موجِ نہر ہے
اٹھو اٹھو کہ سو چکے
عزیز عمر کھو چکے

حافظ غازیپوری

ترانۂ خودی

۱

جبکہ جبریل میں بھی جوہر کردار نہیں
زندگی اہل فلک کی مجھے درکار نہیں
وہ فرشتے ہیں تو ہوں اس سے غرض کیا مجھکو
دیکھنا یہ ہے کہ مجبور ہیں مختار نہیں

۲

جوہر دل سے کفِ خاک جہاں گیر ہوئی
یعنی اکسیر یہ اکسیر سے اکسیر ہوئی
ہے فرشتوں کی تمنا کہ وہ جوہر مل جائے
خاک یہ جس سے امیں صاحب تدبیر ہوئی

۳

سوز گر سینۂ خورشید میں ہے ساز نہیں
اور پردے میں تڑپ سی ہے تو انداز نہیں
مجھکو معلوم ہے جو کچھ ہے فرشتوں کا نیاز
اس جبیں سائی کے پردہ میں امیں ناز نہیں

۴

اس سے انکار نہیں ہے کہ کفِ خاک ہوں میں
جوہر دل سے مگر صاحب ادراک ہوں میں
ہر دو عالم میں ہے شہرہ مری بے باکی کا
اے امیں! پردہ در فطرت چالاک ہوں میں

۵

میں وہ قطرہ ہوں کہ دریا کے ہیں ساماں اس میں
میں وہ ذرہ ہوں کے صحرا کے ہیں ساماں اس میں
میں وہ تاباں ہوں کہ ہے گلشن جنت بکنار
میں وہ نقطہ ہوں کہ دنیا کے ہیں ساماں اس میں

۶

آزر بتکدۂ دہر مرا ہی دل ہے
جو ملائک کا ہے مسجود یہی وہ گل ہے
روئے فطرت کو اسی نے ہی بنایا دلکش
صیقلِ آئینۂ حسن ازل یہ تل ہے

امین حزیں

غزلیات

آزاد انصاری

تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی ٭ لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے ٭ کیا جو ستائیگا وہ ستایا نہ جائے گا
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو ٭ ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ ٭ قسمت کی خوبیوں سے بھرایا نہ جائے گا

نہ تو ہے اور نہ تیری تجلیاں محدود ٭ کہاں تک آنکھ کرے وسعتِ نظر پیدا
ملی ہے اور نہ ملے فکرِ این و آں سے نجات ٭ ہوئی ہے اور نہ ہو صورتِ مفر پیدا

پھر اچانک وحشتِ دل سوئے صحرا لے چلی ٭ پھر ہمارا کاروبارِ شوق ابتر ہو گیا
پھر اُٹھی گردِ ہجومِ یاس دل سے پھر اُٹھی ٭ پھر مری اُمید کا مطلع مکدر ہو گیا
آفریں اچھی مسیحائی دکھائی آفریں ٭ زندگی تو زندگی مرنا بھی دوبھر ہو گیا
آج وہ دن ہے کہ اک ساقی کے دستِ خاص سے ٭ پی اور اتنی پی کہ میں حقدارِ کوثر ہو گیا
کس نے تا منزل رفاقت کی بطلبِ شوق نے ٭ کون رہبر ہو گیا - اللہ رہبر ہو گیا

تم اور چارۂ غمِ فرقت - خوشا نصیب ٭ دکھ کو دوا نصیب مرض کو شفا نصیب
اس خوبیٔ نصیب کے قربان جائیے ٭ حسرت ستم نصیب - تمنا بلا نصیب
میں بے نصیب تھا مرے سر منڈھ دیا گیا ٭ غم آشنا نصیب - ستم آشنا نصیب

افسوس کر کہ وقتِ تلافی گزر گیا ٭ عبرت پکڑ کہ چشمِ کرم رائگاں ہے اب
وہ دن گئے کہ ضبطِ شکایت شعار تھا ٭ مجبوریوں کے ہاتھ میں دل کی عناں ہے اب

باسط بسوانی

قربان میں تیرے رونے کے دشمن کیلئے کیوں روتا ہے
منہ کھول ذرا۔ آنکھیں تو ملا کچھ ہنسنے کا شک ہوتا ہے

جسکی نہ پلک جھپکی تھی کبھی وہ موت کی نیند اب سوتا ہے
بیمار کی تم نے کی نہ دوا اب رونے سے کیا ہوتا ہے

قربان میں ایسی راتوں کے تقدیر سے ایسا ہوتا ہے
میں اسکی بلائیں لیتا ہوں وہ فتنۂ عالم سوتا ہے

جب دل پہ مصیبت ہوتی ہے تب آنکھ میں آنسو آتے ہیں
اتنا تو سمجھ لے اے ظالم کیا کوئی خوشی سے روتا ہے

گو آنکھ سے آنسو بہتے ہیں خاموش مگر ہم رہتے ہیں
یہ بھی تو نہیں کچھ کہتے ہیں کیا عشق میں دلیر ہوتا ہے

مجھ سا بھی کوئی مجبور نہ ہو مجھ سا بھی کوئی معذور نہ ہو
مجھ سا بھی کوئی رنجور نہ ہو میں ہنستا ہوں دل روتا ہے

اے دشمن جان اہل وفا کچھ تجھ پہ فقط موقوف نہیں
محفل سے تری جو اٹھتا ہے وہ بیٹھ کے در پہ روتا ہے

منزل کی طرف سب اہل سفر کس شوق سے بڑھتے جاتے ہیں
اور ایک مصیبت کا مارا تقدیر کو بیٹھا روتا ہے

روشن ہو سواد منزل بھی یوں داغ جگر کو روشن کر
اے رہرو الفت دیر نہ کر اب دیکھ اندھیرا ہوتا ہے

کیوں شکوۂ ظلم و جور کروں بہتر ہے کہ باتیں اور کرو
چپکے سے وہ ہنسکر کہتے ہیں جو ہوتا تھا وہ ہوتا ہے

باسط جو ہمارا مسلک ہے کیا اس سے نہیں تم واقف ہو
دن یاد بتاں میں کٹتا ہے، شب ذکر خدا کا ہوتا ہے

جعفر علی خان اثر لکھنوی

خبر تھی کسے طور بے طور ہوگا
نہ وہ بزم ہوگی نہ وہ دور ہوگا

جو خورشید کہئے تو کہتا ہے وہ شب ہے
اگر ماہ کہئے کہے اور ہوگا

بس اتنی توقع ہے اس بیوفا سے
تغافل کے بدلے کبھی جور ہوگا

ستمگر کے اس قول نے مجھکو مارا
ترا قتل کیا سہل ہے غور ہوگا

تہجد پڑھے جو در میکدہ پر
اثر تو نہ ہوگا کوئی اور ہوگا

مسعود علی ذوقی

خوشدلی سے تلخکامی کا مداوا کیجئے
عشق کی مجبوریوں کو یوں گوارا کیجئے

طالبانِ دید پر کھل جائے رازِ زندگی
اس طرف بھی اک نگاہ بے محابا کیجئے
دہر میں پیشِ نظر ہے گر تلاشِ عافیت
زندگی کی تلخیوں کو بھی گوارا کیجئے
جا پڑے گا خود بخود اڑ کر گلستاں میں قفس
دل میں پہلے جرأتِ پرواز پیدا کیجئے
وسعتِ غم کے لئے کافی نہیں ان کے حدود
ہائے کس صورت سے تکمیلِ تمنا کیجئے
خود بخود اٹھ جائے گا ذوقِ تکلف کا حجاب
بزم میں بیگانہ وش ساقی کو دیکھا کیجئے

تبسم نظامی

عشق کی قوت سے شرحِ حسنِ جاناں چاہئے
ایک "افسانہ" اس افسانے کا عنواں چاہئے
بے اثر ہو چلی ہے داستانِ آرزو
پھر مجھے کیفیتِ شوقِ فراواں چاہئے
عشق کا دامن جو خالی ہے تو ہو لے حسن دست
تیرے دامن میں بہارِ گل بداماں چاہئے
دل کی رگ رگ میں کیا تھا جس نے اک طوفاں بپا
پھر وہی مجھ کو نگاہِ حشر ساماں چاہئے
حسن ہے خاموش آنسو عشق کی آنکھوں میں ہیں
ایسے عالم میں کوئی لحن پریشاں چاہئے
پھر جنوں کی شورشیں ہیں آستین در آستین
میرا پیراہن گریباں در گریباں چاہئے
رات پُرنم چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ہر طرف
میرے سینے پہ تری زلفِ پریشاں چاہئے
پاس رہنا ہو تو کیا ہو اس کا آئینِ قیام
دور رہ کر بھی جسے قربِ رگِ جاں چاہئے

جگر بریلوی

تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں
کشمکش میں نہ روح پڑ جائے
یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں
راہ میں اپنی خاک ہونے دے
اور کچھ میری التماس نہیں
عمر سی عمر ہو گئی برباد
دلِ ناداں عبث اداس نہیں
سانس لینے میں درد ہوتا ہے
اب ہوا زندگی کی راس نہیں
کیا بتاؤں مآلِ شوقِ جگرؔ
آہ قائم میرے حواس نہیں

معلومات

موسیقی کا دوام

مارکونی کے نام سے ایک کمپنی ہے جو "لاسلکیات" کی صنعت و تجارت کے لئے قائم ہے۔ اس کمپنی کے پاس کسی ماہر فن کی تحریر موصول ہوئی ہے کہ گانے والوں کی آوازیں جو اس وقت لاسلکی کے ذریعہ سے دنیا میں منتشر و مشتہر کی جاتی ہیں اور پھر غائب سی ہو جاتی ہیں، فنا نہیں ہوتیں، بلکہ ابد الآباد تک کے لئے قائم ہیں، کیونکہ امواج لاسلکی فنا ہونے والی چیزیں نہیں ہیں اور ایسے آلات کا بنانا ممکن ہے جن کی شدت احساس تمام ایسے نغموں کو جو فضا میں کسی وقت پھیل گئے ہیں ڈھونڈ نکالے اگر یہ صحیح ہے تو اس میں بھی شک نہیں کہ ایسا آلہ ضرور بن کر رہیگا اور پھر نہ صرف آوازیں بلکہ فضا کی تمام وہ چیزیں جن کا تعلق امواج کہربا سے ہے انسانی اقتدار میں آجائیں گی۔

لاسلکی طیران

جنوب فرانس میں ایک ماہر پرواز نے ایک ہوائی جہاز کو بغیر اسکے کہ اسپر چلانے والا یا کوئی اور سوار ہوتا محض لاسلکی کی مدد سے اڑایا۔ اس نے یہ تجربہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ پے درپے دس مرتبہ دکھایا۔ جہاز صرف لاسلکی امواج کہربا کی قوت سے ازخود زمین سے بلند ہوتا اور جب تک وہ شخص چاہتا فضا میں ادہر ادہر پھرتا اور پھر ایک معین مقام پر اتار دیتا۔ حکومت فرانس نے یہ ایجاد مول لینے کا ارادہ کیا ہے تاکہ جنگ کی وقت اگر کبھی ضرورت ہو تو ایسے جہاز استعمال کئے جا سکیں۔

نور کی رفتار میں کمی

فرانس کے ایک ماہر فلکیات کا بیان ہے کہ نور کی رفتار میں کمی پیدا ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ ہر سال نور کی رفتار کا تعین بتاتا ہے کہ ہر سال اس میں کمی ہوتی جاتی ہے اور اس کمی کا اوسط ہر سال ۴ میل فی سکنڈ ہے گزشتہ سال نور کی رفتار کا اندازہ ۱۸۶۲۸۴ میل کیا گیا تھا۔ جو سال ماقبل سے کم تھا، اگر سال آئندہ سال رواں کے لحاظ سے کمی پائی گئی تو یہ بیان بالکل پایۂ تحقیق کو پہونچ جائیگا۔ ہر چند عام لوگوں کے نزدیک یہ نہایت خفیف سا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتا لیکن علمائے طبیعیات کو اپنے بہت سے آرا و افکار میں اس کی وجہ سے تبدیلی کرنا پڑ جائیگی

سماوی شعاعیں

سنہ ۱۹۰۳ء میں دو ماہرین کہربا نے ظاہر کیا تھا کہ بجلی الکٹرسکوپ (آلۂ برق پیما) سے رستی رہتی ہے خواہ وہ کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو جسکے معنے یہ ہوئے کہ ایجابی و سلبی کہربائی شعاعیں اندر آلہ کے پہونچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۰ء میں ایک ماہر برقیات، آلۂ برق پیما کو غبارہ میں اپنے ساتھ لیکر اڑا اور جس وقت وہ ۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ بہ نسبت سطح زمین کے، فضا میں برق پیما کی بجلی زیادہ کم ہو گئی، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جن شعاعوں نے یہ فرق پیدا کیا وہ زمین کی نہ تھیں بلکہ فضا کی تھیں۔ اس کے بعد چار سال تک قبل آغاز جنگ جرمنی وغیرہ کے بعض ماہرین فن اس کی

تحقیق میں مصروف رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غبارہ جس قدر زیادہ بلند ہوتا جاتا ہے، برق پیما کی بجلی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ۹۰۰۰ مٹر کی بلندی پر بہ نسبت زمین کے نوگنا بجلی کم ہو جاتی ہے۔ جنگ کے دوران میں چونکہ تمام علمی تحقیقات معرض التوا میں پڑ گئی تھیں اس لئے یہ مسلسلہ جوں کا توں رہا، لیکن ۱۹۲۱ء سے پھر امریکہ کے دو پروفیسروں نے اس کا تجربہ کیا اور نتیجہ وہی نکلا اسی سلسلہ میں اس تحقیقات کو زیادہ وسیع کر دیا گیا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، برف کے اندر عمیق گڑھوں میں سمندر کی تہ پر بغرض مختلف صورتوں سے مختلف نشیب و ارتفاع اور مختلف درجات حرارت و برودات میں تجربہ کرنے سے معلوم ہوا کہ فضا کے سیاروں سے کہربائی شعاعیں برابر زمین کی طرف آتی رہتی ہیں جو نامعلوم طور پر زمین کے تمام کہربائی کاروبار پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کا صحیح علم ہو سکا ہے کہ یہ شعاعیں کن سیاروں سے زیادہ آتی ہیں اور یہ کہ ان کا اندفاع کیونکر ممکن نہیں ہے تو ان سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کا نام (Cosmic rays) یا سماوی شعاعیں رکھا گیا ہے۔

بحری طیارے

گزشتہ ستمبر میں بحری طیاروں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں برطانیہ اور اطالیہ کے بحری طیاروں نے بحر اڈریاٹک میں شینڈر کپ جیتنے کے لئے مقابلہ کیا۔ اس سے قبل کے سال میں یہ کپ امریکہ کے مقابلہ میں اطالیہ نے جیتا تھا اور اس مرتبہ برطانیہ نے جیتا۔

انگریزی بحری طیارے کی رفتار فی منٹ ۲۸۱ میل سے کچھ زائد تھی ہر چند جہاں جہاں ساحل سیدھا تھا وہاں اس کی رفتار فی منٹ ۳۰۰ میل تھی لیکن موڑ کے مقامات پر پلٹ جانے کے اندیشہ سے اس رفتار کو کم کرنا پڑتا اور اوسط ۲۸۱ میل رہا۔ یہ مقابلہ ۲۲ میل میں ہوا جس میں ۲۲ مقامات پر موڑ تھے۔

متحرک پہاڑ

اس سے قبل پہاڑ ایسی جامد چیز خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا اپنی جگہ سے جنبش کرنا محال سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ثابت قدمی کی مثال ہی پہاڑ سے دیتے تھے، لیکن اب جا کر یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے زبردست ہاتھ میں بڑے سے بڑا پہاڑ پر کاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قلمرو اطالیہ میں بحیرۂ ماگیوری سے جانب شمال تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسے جبل اربینو کہتے ہیں یہ پہاڑ ۵۵۶۰ فٹ اونچا ہے اور اطالیہ کی ماہر طبقات الارض جماعت نے ثابت کیا ہے کہ یہ پہاڑ ۱۸۸۹ء سے حرکت کر رہا ہے اور اس کی چوٹی ۱۹۰۵ء تک (۱۲ سال کے عرصہ میں) ۶ فٹ جانب شرق ہٹ گئی تھی اور ۱۹۲۶ء میں ایک فٹ اور سرک گئی ہے۔ اس کا علم سب سے پہلے اس طرح ہوا کہ جو درخت چوٹی پر قائم تھے ان کا میلان شرق کی طرف نظر آیا اس لئے اس کے شرقی وادی کے لوگ اب اس جگہ کو چھوڑ رہے ہیں کیونکہ بہت جلد اس چوٹی کے گر جانے کا اندیشہ کیا جاتا ہے

سال گزشتہ کے معجزات علم و تحقیق

طب و علاج :- جاپانی ڈاکٹر نے گزشتہ سال اعلان کیا ہے کہ اس نے ان جدید جراثیم کو دریافت کیا ہے جو مفاصلی تپ کا باعث ہوتے ہیں۔

بوسٹن کے ایک ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ پتہ کا عدم انقباض اس میں سنگریزے پیدا دیتا ہے اور ایک جاپانی ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ وٹامین کے بعض اقسام کا کھانے میں نہ پایا جانا پتہ اور گردوں میں

سنگریزے پیدا کر دیتا ہے۔

فن طیران:- امریکہ کی ایک کمپنی نے ہوائی جہاز کے لئے ایک نہایت قوی محرک بنایا ہے جس کی قوت ۱۲۰۰۰ گھوڑوں کی ہے۔ ایک اور آلہ محرکہ ور طیار ہوا ہے جس کا وزن صرف ۵۰، پونڈ ہے اور قوت ۵۲۰ گھوڑوں کی رکھتا ہے۔

فن تعمیر:- کولوراڈو (امریکہ) میں ایک سرنگ ۶ میل کی طویل طیار ہوئی ہے اور ایک سرنگ دریائے ہڈسن کے نیچے، نیویارک اور نیوجرزی کے درمیان دو میل کی طویل بنائی گئی ہے جس کے اندر سے موٹروں کی آمد و رفت ہوتی ہے

فن تصویر:- فوٹو میں سرخ و زرد رنگ سیاہ ہو جاتے ہیں اور نیلا رنگ سپید۔ لیکن کوڈک کمپنی نے سال گزشتہ ایسی شدید حس کے فلم طیار کئے ہیں جو ان رنگوں میں نمایاں امتیاز پیدا کر دیتے ہیں۔

فلکیات:- چار دُمدار ستارے نئے دریافت ہوئے اور یہ ثابت ہوا کہ جس وقت پورا خسوف ہوتا ہے تو سطح قمر کی حرارت کم ہو جاتی ہے۔ زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کی رنگین تصویریں لی گئیں اور اس طرح بہت سے جدید حقایق، ان سیاروں کی بابت دریافت ہوئے

مقناطیس جدید امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے دو معدنی چیزوں کو ملا کر ایک تیسری دھات ایسی پیدا کی ہے جس سے برقی قمقموں کے تار بنائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مرکب نہایت شدید مقناطیسیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک پونڈ وزن کا ٹکڑا ۱۳۰ پونڈ وزن کے لوہے کو اٹھا سکتا ہے۔

حیرتناک سرعت حرکت جاپان کے بیرن شیبا نے جو انجمن فن پرواز کا ناظم ہے، ایک ایسا آلہ تصویر کھینچنے کا طیار کیا ہے جو ایک منٹ میں متواتر دو ہزار تصویریں لے سکتا ہے۔ اس آلہ کے ذریعہ سے جو تصویریں سنیما کے لئے لی جائیں گی اُن کو دکھانے میں بحساب دو ہزار تصویر بیس منٹ صرف ہوں گے اس آلہ کے ذریعہ سے ان افعال طبیعی کے بھی تصویر لی جا سکے گی جنکی اپنی سرعت کے لحاظ سے تصویر نہیں لی جا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب انھیں تصاویر کو آہستہ آہستہ کر کے دکھایا جائیگا تو علما ان مدارج و منازل کے تحلیل کر سکیں گے جو کسی حدوث طبیعی کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔

رنگین تصاویر اور لاسلکی اسوقت تک لاسلکی کے ذریعہ سے جو تصاویر منتقل ہوتی تھیں وہ صرف سیاہ و سپید خطوط کا مجموعہ ہوتی تھیں، لیکن اب ڈاکٹر کاروس نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے رنگین تصویریں بھی منتقل ہو سکیں گی۔

تاریخ عجیب

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جسے شیر محمد صاحب کاکوروی نے حضرت سلمان فارسی کے حالات و سوانح میں تحریر کیا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں حجام قوم کی بھی تحقیق کی گئی ہے کہ وہ کس قدر شریف اصلیت رکھتی ہے اور اس قوم کے موجودہ اوضاع و اطوار پر بھی تنقید کی گئی ہے قیمت ۴ر ملنے کا پتہ:- اس۔ اچ۔ شیر محمد مشین ساز نظیر آباد لکھنؤ۔

- سکامنی ۸ر
- سوانح عمرو عیار ۸ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس عہ ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۲ر
- مارآستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی عہ
- سکینہ بنت حسین ۶ر
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- مخدرات عہ ۸ر
- جویائے حق للعہ
- نعمت جبین عہ
- فاتح مفتوح عہ ۴ر
- بابک خرمی عہ ۸ر

- الفانسو ۲/۳ر
- ایام عرب ۸ر
- قیس ولبنیٰ ۴ر
- یوسف و نجمہ ۸ر
- زوال بغداد ۸ر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین ۸ر
- رومۃ الکبریٰ ۸ر
- فلپانا ۸ر
- شوقین ملکہ عہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن عہ
- بدر النساء کی مصیبت ۳ر
- خوفناک محبت ۴ر
- میوۂ تلخ ۸ر
- نیکی کا پھل عہ

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

- نیل کا سانپ ۹ر
- رام پیاری عہ
- عبرت ۸ر
- حسن سرور للعہ
- اختر حسینہ ۸ر
- دیول دیوی ۹ر
- جعفر عباسہ ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق ۸ر
- قاسم و زہرہ عہ
- نیرنگ جمال ۴ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زندانی ۶ر
- اصلاح زبان ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- " دوسری کتاب ۸ر
- " تیسری ۸ر
- " چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی-اے

- بندگی
- کاس الکرام ے
- لسان الغیب جلد اول ے
- " دوم
- " سوم ۸ر
- " چہارم ۸ر
- نمکدان فصاحت ۸ر
- بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی-اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری عہ ۴ر

- بہرام کی گرفتاری عہ

مولوی عبدالماجد بی اے

- فلسفۂ جذبات ۸ر
- مکالمات برکلے ۸ر
- پیام امن ۴ر
- تصوف اسلام عہ
- زود پشیمان ۸ر
- فلسفیانہ مضامین ۸ر

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن للعہ
- سیرۃ عائشہ ۸ر
- حیات امام مالک عہ
- خلافت عثمانیہ عہ
- خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

- اسوۂ صحابہ دو جلد ے
- سیرۃ عمر بن العزیز ۸ر
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین ۸ر
- فقرائے اسلام ۸ر
- فطرت نسوانی ۸ر
- شعر الہند دو جلد ے

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول
- " دوم ے
- سیر الصحابیات ۴ر

مولوی عبدالباری ندوی

- مبادی علم انسانی ۸ر
- برکلے کا فلسفہ ۸ر

مولوی عبدالرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی و یورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات ۸ر
- تاریخ الدولتین ۸ر

سید سجاد حیدر بی اے

- زہرا ۱۲ر
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
- خیالستان ۸ر
- ثالث بخیر ۸ر
- حکایات و احتساسات ۴ر

مولوی راشد الخیری

- صبح زندگی ۴ر
- شام زندگی عہ
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- منازل السائرہ

- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک ۸ر
- عروس کربلا ۸ر
- یاسمین شام ۸ر
- تیغ کمال عہ
- ماہ عجم ۸ر
- محبوبۂ خداوند ۴ر
- موودہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- مقدمۂ شعر و شاعری ۸ر
- دیوان حالی ۸ر

تاریخی و دلچسپ جاسوسی ناول

- سراب فلسطین ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۸ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس عہ
- شیخ چلی عہ
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس ۸ر
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس ۸ر
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور ۸ر
- زر پرست ۴ر

کبھی کا راز ۔ عہ
عبد الرحمن ناصر ۔ عار
عروس مصر ۔ عار
سیلاب خون ۔ ۸ر
کرشمہ ۔ عہ
وفادار دلہن ۔ عہ
طواف زمین ۔ عہ
سیاحت زمین ۔ عہ
سیاحت ہوا ۔ عہ
نازنین مراکش ۔ ۸ر
سمندر کی سیر ۔ عار
اسرار بالشویزم ۔ ۸ر
روح لیلیٰ ۔ ے
امین بک ۔ عہ
حجاج بن یوسف ۔ عہ
یوسف پاشا ۔ عہ
انقلاب عثمانی ۔ ۸ر
نیلی چھتری ۔ عہ
بہرام کی آزادی ۔ ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری ۔ عہ
بہرام کی سرگزشت ۔ عہ
پر اسرار قتل ۔ عار

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۔ ے
بزم خیال ۔ عہ
مشاطۂ سخن ۔ عہ
انشار نسواں ۔ ۶ر
مکاتیب محسن الملک ۔ ۸ر
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۔ ۸ر

مثنوی قاسم وزہرہ ۔ ۱۲ر
فسانۂ جوش ۔ عہ

تاریخی کتابیں

تاریخ اندلس ۔ ۱۲ر
تاریخ عرب ۔ صہ
اسرار رنگون ۔ عہ
شباب لکھنؤ ۔ عہ
مرقع اودھ ۔ ۸ر
ارض بحرین ۔ ۸ر
تفریح الاذکیا ۔ ے
تاریخ حبیب اللہ ۔ ۸ر
مراۃ الکونین ۔ عار
البدر ۔ عہ
قصص الانبیا ۔ عار
صمصام الاسلام ۔ عار
فتوح الشام ۔ عار
تذکرۃ الکرام ۔ عار
منہاج النبوۃ ۔ صہ
حیات العلماء ۔ عہ
مذاہب الاسلام ۔ للعہ
روضۃ الصفا ۔ صہ
تاریخ اودھ ۔ عہ
خواتین رنگون ۔ عہ
سیر المتاخرین ۔ للعہ
اعمالنامہ روس ۔ للعہ
تاریخ مصر ۔ ے

سلاطین اودھ ۔ ے
صحیفۂ زرین ۔ للعہ
تاریخ دربار ۔ ے
تاریخ ایران ۔ ے

تصوف و اخلاق

سیر الطیبات ۔ عہ
علم الاخلاق ۔ عہ
خدا کی ہستی ۔ عہ
نابینا علماء ۔ ۸ر
مختارات صوفیہ ۔ عہ
حیات ابدی ۔ عہ
افراد کا سبب ۔ ۸ر
عوارف المعارف ۔ عہ
بوستان معرفت ۵ جلد ۔ عہ
شجرۂ طریقت ۔ عہ

مراثی

مراثی دبیر ۔ عار
مراثی انیس ۔ للعہ
مراثی منیر ۔ عہ
مراثی مونس ۔ ے
مراثی دلگیر ۔ ے

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۔ ۱۱ر
گلشن بیخار ۔ ۱۰ر

سراپائے سخن ۔ عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی ۔ عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۔ ۸ر
کلیات عراقی ۔ ۱۲ر
دیوان حافظ ۔ عہ
دیوان نعمت خان عالی ۔ عہ
کلیات انوری ۔ عار
دیوان بیدل ۔ ۱۰ر
کلیات سعدی ۔ عہ
دیوان عرفی ۔ ۱۲ر
کلیات جامی ۔ عہ
کلیات غالب ۔ عہ
کلیات صائب ۔ عہ
کلیات حزین ۔ عار
دیوان عنصری ۔ عہ
دیوان ظہیر فاریابی ۔ ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۔ ۶ر
دیوان ناصر علی ۔ ۵ر
دیوان ہلالی ۔ ۶ر
کلیات جلال اسیر ۔ عہ

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۔ ۶ر
کلیات ظفر ۔ عار
کلیات مومن ۔ ۱۰ر

دیوان ناسخ ۔ عہ
کلیات میر ۔ عہ
کلیات سودا ۔ عہ
کلیات انشا ۔ عہ
کلیات نظیر اکبرآبادی ۔ عہ
گلزار داغ ۔ عہ
دیوان رند ۔ ۹ر
دیوان ذوق ۔ ۱۲ر
کلیات اسماعیل ۔ عار
مراۃ الغیب ۔ عہ
صنمخانۂ عشق ۔ عار
فریاد داغ ۔ ۸ر
دیوان قابل ۔ ۸ر
دیوان شہیدی ۔ ۸ر

فن شعر و عروض

زر کامل عیار ۔ ۱۲ر
ترجمہ حقائق البلاغت ۔ ۸ر
عروض سیفی ۔ ۲ر
شجرۃ العروض ۔ ۳ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین ۔ عہ
ایضاً با تصویر سادہ ۔ للعہ
مجمع الفنون ۔ ے
طلسم فرنگ ۔ عار
کارخانۂ عالم ۔ عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ولیلی ۔ عہ
فریب حسن ۔ عار
سوزش عشق ۔ عہ
روز الیمبرٹ ۔ للعہ
ناول اسرار ۔ عار
شام جوانی ۔ ے
طلسمی فانوس ۔ عہ

زنانہ کتب خانہ

شوکت آرا بیگم ۔ ے
درس حمایت ۔ ے
خاتون جنت ۔ عار
بیوی کی تربیت ۔ عہ
بہشتی زیور ۔ ۱ حصے ۔ عار
بہشتی گوہر ۔ ۱۰ر
اقبال دلہن ۔ عہ
حسن معاشرت ۔ عہ
جواہر ریزے ۔ ۸ر
عورتوں کی انشار ۔ عہ
بیوی کی تعلیم ۔ عہ
تربیت اطفال ۔ عہ
اصلاح معیشت ۔ عہ
شمع ہدایت ۔ عہ
اصلاح الرسوم ۔ ۸ر
جہاں آرا بیگم ۔ ۸ر
بچوں کی پرورش ۔ عار
آرسی مصحف ۔ ۱۰ر
سدا سہاگ ۔ ۸ر
ترغیب روزگار ۔ عہ

نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

(مطبوعہ نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام نیاز فتحپوری)